مارچ 2018
www.shibliinternational.com

SIECT

ماہنامہ

صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly SADA E SHIBLI Hyderabad

کہیں صدیوں میں ہوتا ہے یہ فیضِ خاص ربانی
نہیں اٹھتے ہمیشہ دہر میں شبلیِ نعمانی

ایڈیٹر ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

-/10 روپے

علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی، سماجی اور معلوماتی شاہکار

ماہنامہ

صدائے شبلی

حیدرآباد

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری، ڈاکٹر عبد القدوس، ابو ہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، پروفیسر مظفر علی شہہ میری
حضرت رحمان جامی، پروفیسر محسن عثمانی ندوی پروفیسر ابو الکلام
پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی
مولانا ارشاد الحق مدنی، مولانا محمد مساعد ہلال احیائی
اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ، محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال
ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو
ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین
ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان
ابو ہریرہ (اینکر ای ٹی وی) محسن خان

مارچ ۲۰۱۸ء

قیمت فی شمارہ:10 سالانہ:120

A.c : MOHD MUHAMID HILAL
A.c: 52023475202
Ifsc: SBIN0020413
Mrcr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں ہے

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL#17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اداریہ	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	3
۲	شبلی ایک عاشقِ رسولؐ	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	4
۳	سائنس اور مسلمان	ابوہریرہ یوسفی	9
۴	عالم انسانی کو درپیش ایک سنگین خطرہ	مولانا سید احمد ومیض ندوی	11
۵	موازنہ انیس ودبیر کا محاکمہ	ڈاکٹر بی داؤد محسن	16
۶	شمس الرحمٰن فاروقی بحیثیت ترجمہ نگار	ڈاکٹر حمران احمد معروفی	22
۷	مولانا ابوالکلام آزاد اور تقسیم ہند	ارشد جمیل	26
۸	عہد آصفیہ کا ایک نامور شاعر: ماہر القادری	محمد شاہد صدیقی	32
۹	نعت/غزل	حضرت رحمان جامیؔ	36
۱۰	نعت/غزل	عثمان ساحرؔ	37
۱۱	نذر عقیدت آستانِ شبلی	یحییٰ اعظمی	38
۱۲	ونڈے کرکٹ کا وراث	ابوہریرہ (ای ٹی وی)	39
۱۳	تبصرہ کتب	ابوہریرہ یوسفی	40

☆☆☆

اداریہ

تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہاں کا پروردگار ہے۔اس نے اس کائنات کی لفظ کن سے تخلیق فرمائی،تخلیقی مرحلے میں قلم کو اوّلیت دی،اسی کا خاص فضل وکرم ہوا کہ ہم احباب کو ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کی اشاعت کے لئے منتخب فرمایا۔بارگاہِ خداوندی میں بے شمار کلمۂ شکر ادا کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ یا پاک پروردگار! ہماری اس سعی کو قبول فرما اور دین ودنیا کے لئے سعادت کا ذریعہ بنا۔آمین

علامہ شبلی نعمانی کا علمی سورج نصف النہار کو پہنچ چکا تھا،ملک بھر میں ان کی شہرت پھیل چکی تھی،وہ نامساعد حالات کی وجہ سے علی گڑھ میں سرسید کے آستانے سے مستعفی ہوچکے تھے،انفرادی اور علمی ضرورتوں کی وجہ سے ریاست حیدرآباد میں سررشتۂ علوم وفنون کی نظامت کے عہدے پر ۲۲رمئی ۱۹۰۱ء میں فائز ہوئے۔الغزالی،الکلام،سوانح مولانا روم،موازنہ انیس ودبیر جیسی معرکۃ الآراء کتابیں چند سالوں میں تصنیف کیں اور دیگر مصنفوں اور شاعروں کے لئے اپنی دورِ نظامت میں راہیں کھولیں،کچھ ناگزیر وجوہات کی وجہ سے ۱۹۰۵ء میں اس عہدے سے مستعفی ہوگئے۔حضور نظام علامہ شبلی نعمانی سے بے انتہا محبت رکھتے تھے،ان کے لیے انہوں نے ماہانہ وظیفہ جاری کیا،''سیرت النبیؐ'' کے لیے گراں قدر تعاون دیا اور اپنے دستِ مبارک سے ''سیرت النبیؐ'' کے لیے ایک خط لکھا،جو دارالمصنفین کے میوزیم میں آج بھی موجود ہے،جبکہ ایک صدی گزرنے کے بعد بھی نبیرہ میر عثمان علی خاں،نواب مفخم جاہ بہادر دارالمصنفین کے منصب صدارت پر فائز ہیں۔

اسی علمی اور ادبی تعاون کی بنیاد پر ہم احباب کو اس بات کا احساس ہوا کہ انہیں کی فکر کے مطابق ایک ادارہ قائم کیا جائے،کیونکہ علم وفن کے شہر حیدرآباد سے علامہ شبلی نعمانی کو ایک خاص نسبت حاصل تھی۔اللہ کے فضل سے اکتوبر ۲۰۱۶ء کو شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ کے نام سے ادارے کا رجسٹریشن ہوا،ماشاء اللہ ٹرسٹ روزِ اول سے علمی،ادبی،سماجی خدمات میں مصروف ہے۔اللہ رب العزت ٹرسٹ کے مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔آمین۔ان شاء اللہ ٹرسٹ کے کارکردگی کی تفصیلی رپورٹ اگلے شمارے میں پیش کی جائے گی۔ٹرسٹ ھذا کی ماہانہ میٹنگ کے مشورے میں یہ بات طے پائی کہ ایک ماہنامہ رسالہ جاری کیا جائے اور اس میں نومشق قلم کاروں،ریسرچ اسکالروں کو زیادہ سے زیادہ لکھنے کا موقع فراہم کیا جائے اور ماہر تجربہ کار مشاقوں کے قیمتی مضامین بطور رہبری کے شامل کئے جائیں اور اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ تخلیقات میں تعمیری پہلو ہو،کیونکہ شبلی کے یہاں تعمیر ہی تعمیر نظر آتی ہے۔

رسالے کے رجسٹریشن کا مسئلہ آیا تو ہم نے پانچ مخصوص نام آراین آئی (RNI) کے لئے بھیجا،ان ناموں میں سے آراین آئی نے ''صدائے شبلی'' کا ٹائٹل ہمارے لئے منتخب کیا،جو ہماری منشا کے عین مطابق تھا۔

''صدائے شبلی'' کے مشاورتی اور ادارتی بورڈ میں ملک کے قدآور ادیبوں اور دانشوروں کی ٹیم شامل ہے۔یہ ہمارے لیے باعث افتخار ہے،ہم ان تمام حضرات کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے نہ صرف ہماری درخواست کو شرف قبولیت سے نوازا۔امید قوی ہے کہ ان عظیم شخصیات کی رہنمائی میں ''صدائے شبلی'' بلندیوں کے نئے افق پر چمکے گا۔انشاء اللہ

اراکین ''صدائے شبلی'' کے عزائم ہیں کہ وہ اپنے قارئین تک اعلیٰ تحقیقی،مذہبی،ادبی،سماجی وغیرہ مضامین پہنچائیں،اس لیے علماء، فضلاء،پروفیسرس،ڈاکٹرس،ریسرچ اسکالر وغیرہ سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ آپ اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات ان پیج فائل میں بذریعہ ای میل ارسال فرمائیں اور مفید مشوروں سے نوازیں۔جزاک اللہ خیرا

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
رفیق اعزازی: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

شبلی - ایک عاشق رسول ﷺ

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کی تعلیم وتربیت قدیم طریقہ تعلیم کے مطابق چٹائیوں پر ہوئی تھی، درسیات کی تکمیل بالخصوص علوم دینیہ قرآن وحدیث، تفسیر اور شعروادب وغیرہ کی تحصیل میں بڑی تگ ودو اور جدوجہد کی، اپنے عہد کے علوم دینیہ کے ماہرین اور یگانہ روزگار ارباب کمال کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا، مولانا فاروق چریا کوٹی، مولانا ارشاد حسین رام پوری، مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کے دامن تربیت میں ان کا علمی، ادبی اور مذہبی شعوراس قدر پختہ ہوا کہ حالات کے تمام سردوگرم کے باوجود انھوں نے اپنی مذہبی حیثیت کا ہمیشہ پاس ولحاظ رکھا، ان کی تمام تر علمی وتصنیفی کوششیں محض اسلام کے بقاء وتحفظ اوراس کی سربلندی کے لئے تھی اور جس طرح انھیں اپنا مذہب عزیز تھا اسی طرح وہ اپنے رسولؐ کے بھی ابتداء ہی سے بڑے عاشق وشیدائی تھے، مولانا سید سلیمان ندوی نے درست لکھا ہے کہ اس نام نامیؐ کے ساتھ ان کی عقیدت کی کوئی حد پایاں نہ تھی۔(۱) واقعہ یہ ہے کہ وہ حب نبویؐ سے ہمیشہ سرشار رہے۔

۱۹؍سال کی عمر میں تعلیم سے فراغت کے بعد وہ والدین کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے اور جب روضۂ اطہر پر نظر پڑی تو ان کا والہانہ عشق نبویؐ ایک مثنوی کی شکل میں ظاہر ہوا، چنانچہ انھوں نے خود روضۂ اقدس پر وہ مثنوی پیش کی، جس کے چند اشعار یہ ہیں:

اے بہ کرم کار جہاں کرد ساز   مرہمہ را پیش تو روے نیاز
چوبہ درت آمدہ ام با امید   از کرم خویش مکن نا امید
چوں بہ درت آمدم امیدوار   سایہ لطفے ز سرم بر مدار (۲)

۱۸۸۳ء میں جب وہ علی گڑھ سے وابستہ ہوئے تو وہاں انھیں مذہبی روح نظر نہیں آئی، چنانچہ انھوں نے اس کمی کو اس طرح دور کرنے کی کوشش کی کہ کالج میں میلاد کی مجلسوں کی بنیاد ڈالی، جس میں سیرت نبویؐ کے کسی پہلو پر وہ خود تقریر کرتے، میلاد کے یہ جلسے ابتداءً اپنے بنگلے پر کرتے رہے پھر سیرت کا ایک بڑا جلسہ شان وشوکت کے ساتھ سالار منزل میں کیا اور پھر یہ جلسے اہتمام کے ساتھ اسٹریچی ہال میں ہونے لگے اور یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے۔

طلبائے علی گڑھ میں سیرت نبویؐ کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کے لئے انھوں نے سیرت نبویؐ پر عربی میں ایک رسالہ تاریخ بدءالاسلام لکھا جو عرصہ تک کالج کے نصاب میں شامل رہا اور بقول ڈاکٹر انور خالد محمود "اس رسالہ نے نہ صرف طلبہ کے دلوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عقیدت ومحبت کے جذبات پیدا کئے بلکہ خود مصنف کے دل میں عشق رسول کی قندیل روشن کردی (۲)

عشق رسول کی یہ لے سیرۃ النعمان کے منظوم دیباچے میں حد انتہا کو پہنچ گئی۔

شیفتۂ گانیم و پیمبر پرست ☆ سجدہ اگر نیست زمیں بوس ہست

علی گڑھ میں انھوں نے ناموران اسلام کے حالات و سوانح قلم بند کرنے کا منصوبہ بنایا اور المامون، سیرۃ النعمان اور الفاروق جیسی معرکہ آراء کتابیں لکھیں، اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ جب انھوں نے ناموران اسلام کا آغاز کیا تو بارہا ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ ان ناموروں سے پہلے سب سے اول اس نامور (ﷺ) کا نام آنا چاہئے جس کی ناموری نے ان سب کو نامور بنایا۔(۳) مگر یہ ایک ایسا نازک اور اہم فریضہ تھا کہ علامہ شبلی عرصہ تک اس کے ادا کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ (۴) ان کا خیال تھا کہ آنحضرت ﷺ کے واقعات میں ایک حرف بھی صحت کے اعلیٰ معیار سے ذرا اتر جائے تو سخت جرم ہے۔(۵)

علی گڑھ کے بعد علامہ شبلی حیدر آباد کے سررشتہ علوم وفنون سے وابستہ ہوئے تو سلسلہ کلامیہ کے ساتھ سیرت نبویؐ کی تالیف کا عزم اور مضبوط ہوا، چنانچہ یہیں انھوں نے سیرت نبویؐ لکھنا چاہا مگر بوجوہ نہ لکھ سکے، ان کی نگاہ میں سیرت نبویؐ کی تالیف وتدوین کا معیار بہت بلند تھا، فرماتے تھے کہ سوانح عمری ایسی لکھنی چاہئے جس سے صاحب سوانح کا پایا اونچا نظر آئے، لیکن ہم مسلمانوں کے دلوں میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا پایہ اتنا اونچا ہے کہ کوئی کتاب اس کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتی، اس لئے سیرت کی کوئی کتاب مشکل ہی سے معیار پر پوری اتر سکتی ہے۔(۶)

سلسلہ کلامیہ کے بعد شعر العجم کا سلسلہ شروع ہوا اور ناموران فارس کے بلند ادبی و شعری محاسن بیان کرنے کے دوران شبلی کا رہوار قلم آستانۂ نبوت پر جا پہنچا اور شعر العجم تشنۂ تکمیل چھوڑ کر وہ دربار رسالت میں اس طرح حاضر ہوئے کہ پھر دم واپسیں تک اس سے جدا نہ ہوئے، ان کے عشق رسول کا اندازہ تدوین سیرت سے متعلق ان کے اس عزم سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہوسکتی۔'' (۷) ان کا عشق رسول اس درجہ پر پہنچ گیا تھا کہ وہ سیرت رسول کو مجموعۂ ضروریات دینی ودنیوی خیال کرتے تھے، لکھتے ہیں:

''یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے اور مختصر یہ کہ مجموعۂ ضروریات دینی ودنیوی ہے۔''(۸)

شبلی عاشق رسول کے وفور جذبات کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے دل میں یہ جذبہ پروان چڑھا کہ خدمت سیرت ہی میں وہ جان جان آفریں کے سپرد کردیں، اسے انھوں نے خاتمہ بالخیر قرار دیا۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی

مجھے چند مقیم آستان غیر ہونا تھا

مگر اب لکھ رہاہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سیرت نبویؐ کی تصنیف وتالیف میں وہ مصروف ہوئے اور سیرت کی کتابوں کا مطالعہ وجائزہ لینا شروع کیا تو شبلی کا عشق نبویؐ پختہ سے پختہ تر اور دل ودماغ میں جاگزیں ہوگیا اور ان پر عالم وجد کی کیفیت طاری ہوگئی، اس حال میں انھوں نے فرمایا۔

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حال سرور عالم
دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہ عالم قدوس سے آئی
کہ ہے یہ اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

ہمارے نقادوں نے شبلی کو نعت نگاروں میں شامل نہیں کیا ہے، لیکن یہ قطعہ ان کی بلند نعت گوئی کا بہترین مظہر ہے، اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے نعتیہ ادب میں اس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے، تو غالباً مبالغہ نہ ہوگا۔

اخیر دور میں انھوں نے متعدد مذہبی اور اخلاقی نظمیں لکھیں اس میں کئی نظموں کا تعلق نعتیہ شاعری سے ہے، ہجرت نبویؐ، تعمیر مسجد نبویؐ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلم اور عفو وغیرہ نظمیں نہ صرف ان کی نعتیہ شاعری کا نمونہ ہیں بلکہ ایک عاشق رسول کے دلی جذبات واحساسات کا آئینہ بھی ہیں، ہجرت نبویؐ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

انصار پاک اور مہاجر تھے جس قدر — مزدور بن گئے کہ خدا کا یہ کام تھا
اک اور نفس پاک بھی ان سب کا تھا شریک — جو آب وگل کے شغل میں بھی شاد کام تھا
کندھوں پہ اپنے لاد کے لاتا تھا سنگ وخشت — سینہ غبار خاک سے سب گرد فام تھا
سمجھے کچھ آپ کون تھا ان کا شریک حال — یہ خود وجود پاک رسول انامؐ تھا
جو وجہ آفرینش افلاک وعرش ہے — جس کا کہ جبرئیل بھی ادنٰی غلام تھا
صلوا علی النبی واصحابہ الکرام — اس نظم مختصر کا یہ مسک ختام تھا

ان کی دوسری تاریخی نظم جس میں انھوں نے ہجرت کے واقعہ کی منظر کشی کی ہے، اس کے ایک ایک حرف سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس سے ان کی والہانہ شیفتگی ظاہر ہوتی ہے، پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

علامہ شبلی مدۃ العمر مخالفین اسلام کا جواب دیتے رہے، وہ اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن پر بے جا اعتراضات برداشت نہیں کر سکتے تھے، اور جب انھوں نے سیرت پر یورپ کے مصنفین کی کتابیں دیکھیں جس میں انھوں نے ذات اقدس کو ہدف تنقید وتنقیص بنایا تھا تو انھیں سخت تکلیف پہنچی، چنانچہ انھوں نے یورپ کے بے درد واقعہ نگاروں کی سختی سے تردید کی اور سیرت نبوی کا صاف

وشفاف آئینہ دکھلایا کہ تمام نفوس قدسیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سب سے متبرک اور بابرکت ہے۔

ان کا خیال تھا کہ سیرت کی ضرورت صرف مسلمانوں کو نہیں تمام عالم کو اس کی ضرورت ہے۔(۹) یہی وجہ ہے کہ وہ سیرت کو انگریزی میں شائع کرنے کے خواہاں تھے تاکہ یورپ کے خیالات کی اصلاح ہو سکے۔(۱۰)

ان مقاصد اور خمار عشق نبویؐ میں انھوں نے سیرۃ النبی کا آغاز کیا اور انتہائی بلند معیار پر سیرۃ النبی قلمبند کی اور جب ولادت نبویؐ کے مقام پر پہنچے تو شبلی کا عشق رسول حد انتہا کو پہنچ گیا، اس موقع پر انھوں نے ایسی دلآویز اور لافانی تحریر سپرد قلم کی جس کی مثال عالمی ادب میں ملنی مشکل ہے:

> ”چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں، لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنان قضا وقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں ابروباد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید براہیم، جمال یوسف، معجزہ طرازی موسوی، جاں نوازی مسیح سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارض شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں کام آئیں گے۔
>
> آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی فرخ بال ہے، ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتش کدہ فارس بجھ گیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے، آتش کدہ فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدہ کفر، آزرکدہ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔
>
> توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت میں بہار آگئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔“(۱۱)

اسی سرمستی اور جذب وشوق میں وہ سیرۃ النبی لکھ رہے تھے کہ ان کا وقت موعود آپہنچا اور ایک عاشق رسول سیرت سیرت کہتے ہوئے اپنے مالک حقیقی کے حضور جا پہنچا۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اس طرح شبلی کے منہ سے جو آخری کلمات نکلے وہ بھی حب نبوی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

سیرت النبیؐ دراصل علامہ شبلی کے عشق رسول کا نمونہ اور نذرانہ عقیدت ہے، اس کا اندازہ سیرت النبیؐ کے سرنامہ سے بھی

لگایاجاسکتاہے، لکھتے ہیں:

''ایک گدائے بے نواشہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص وعقیدت کی نذر لے کرآیا ہے۔

ز چشم آستیں بردار وگوہر را تماشا کن

(شبلی)

حوالے

(۱) حیات شبلی ،ص ۱۰۷ (۲) ایضاً ص ۹۲ (۳) اردو نثر میں سیرت رسول ، ص ۵۳۸ (۴) حیات شبلی ، ص ۲۰۷ (۵) سیرت النبیؐ ج ۱ مقدمہ ص ۴ (۶) مقالات شبلی ج ۸ ص ۳۳ (۷) حیات شبلی ص ۲۰۳ (۸) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۲۴۲ (۹) سیرت النبیؐ ج ۱ مقدمہ ص ۴

(۱۰) ایضاً ج ۱ مقدمہ ص ۱-۴ (۱۱) مقالات شبلی ج ۸ ص ۳۶ (۱۲) سیرت النبیؐ ج ۱ ص ۱۱۴

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد میں مناسب قیمت پر اشتہار کے ذریعہ اپنے کاروبار اور تجارت کو فروغ دیجئے

چھ ماہ مسلسل اشتہار پر ایک مہینہ مفت اور ایک سال اشتہار پر دو مہینہ مفت اشتہار شائع کیا جائے گا

سرورق پشت مکمل	ملٹی کلر	10000 روپے
سرورق پشت نصف	ملٹی کلر	6000 روپے
سرورق پشت چوتھائی	ملٹی کلر	4000 روپے
سرورق اندرونی مکمل	ملٹی کلر	7000 روپے
سرورق اندرونی نصف	ملٹی کلر	4000 روپے
سرورق اندرونی چوتھائی	ملٹی کلر	2500 روپے
اندرونی صفحہ مکمل	بلیک اینڈ وائٹ	2000 روپے
اندرونی صفحہ نصف	بلیک اینڈ وائٹ	1500 روپے
اندرونی صفحہ چوتھائی	بلیک اینڈ وائٹ	1000 روپے
سرورق ایک انچ	ملٹی کلر	200 روپے
اندرونی صفحہ ایک انچ	بلیک اینڈ وائٹ	100 روپے

اشتہار کے لئے رابطہ کریں 9392533661-8317692718

پتہ آفس: مکان نمبر 17-6-352 سیکنڈ فلور، بافنا کمپلکس، نزد آصفیہ مسجد، دبیر پورہ روڈ، پرانی حویلی، حیدرآباد تلنگانہ

ابو ہریرہ یوسفی

سائنس اور مسلمان

اس کائنات کو اللہ رب العزت نے اپنی قدرت سے تخلیق کیا ہے، فانی دنیا کو عدم سے وجود میں لانے کے بعد رب قدیر نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ اللہ نے جہاں حضرت آدم علیہ السلام کو نبوت کے ساتھ دیگر علوم سکھلایا، وہیں دنیا کے اسماء کا علم بھی سکھایا۔ مفسرین قرآن نے لکھا ہے کہ اسماء سے مراد اشیاء کے خواص ہیں اور اسی کا نام سائنس ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ہمارے پروردگار نے ہی سائنسی علوم سکھایا۔ قرآن میں بھی اللہ نے جا بجا سائنس کے تعلق سے آیات نازل کیا ہے۔ چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ O الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ O

(آل عمران،3:190،191)

بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور شب و روز کی گردش میں عقلِ سلیم والوں کیلئے (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو (سراپا نیاز بن کر) کھڑے اور (سراپا ادب بن کر) بیٹھے اور (ہجر میں تڑپتے ہوئے) اپنی کروٹوں پر (بھی) اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق (میں کارفرما اُس کی عظمت اور حسن کے جلووں) میں فکر کرتے رہتے ہیں۔ (پھر اُس کی معرفت سے لذّت آشنا ہو کر پکار اُٹھتے ہیں) اے ہمارے رب! تو نے یہ (سب کچھ) بے حکمت اور بے تدبیر نہیں بنایا۔ تو (سب کوتاہیوں اور مجبوریوں سے) پاک ہے، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مذکورہ چند آیات میں ایک مسلمان کی خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ ہر حالت میں جہاں

اللہ کو یاد رکھتا ہے وہیں اللہ کی تخلیق کردہ کائنات کے آسمانوں اور زمینوں میں غور وفکر کرتا ہے۔اللہ نے اس آیت میں مذہب اور سائنس دونوں کا تذکرہ کیا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو اسلامی تعلیمات کے ساتھ سائنسی علوم بھی حاصل کرنا چاہئے ،اس لئے کہ یہ دنیا دارالاسباب ہے، بغیر اسباب کے انسان زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔دنیا کے لئے سائنسی ایجادات انتہائی ضروری ہے، اس لئے کہ ہمیں قدم قدم پر سائنس کی ضرورت سے واسطہ پڑتا ہے اور دنیا کے جمیع انسانوں کی ترقی سائنس سے ہوئی اور ہورہی ہے، چنانچہ اگر دور جدید پر نظر رکھا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جس قوم نے بھی سائنس پر توجہ دیا، وہی آج دنیا میں سب سے زیادہ کامیاب اور طاقتور ہے۔آج مسلمانوں کی پسماندگی اور کمزوریوں کی بہت ساری وجوہات میں سے ایک اہم وجہ سائنسی سے عدم دلچسپی ہے۔حالانکہ مسلمانوں کا ماضی سائنس کے تعلق سے تاریخ ساز ہے، لیکن ہم نے اپنی سائنسی میراث کی حفاظت نہیں کی اور اس کو نسلوں تک منتقل نہیں کیا، جس کی وجہ سے آج ہم سائنس میں بالمقابل دیگر قوموں سے کافی پیچھے ہیں۔ہم ہر سائنسی ایجادات کو استعمال میں لاتے ہیں، ہم اپنے مذہبی امور میں بھی غیروں کے سائنسی ایجادات استعمال کرتے ہیں ،لیکن ہم اس کو اپنی تعلیمات کا حصہ نہیں بناتے ہیں، ہم مذہبی درسگاہیں تو قائم کرتے ہیں، لیکن اس میں سائنسی علوم کا کوئی شعبہ قائم نہیں کرتے ہیں، جس کی وجہ سے آج ہم دنیا کی بیس فیصد آبادی کے برابر ہونے کے باوجود سائنس میں ہمارا کوئی حصہ نظر نہیں آرہا ہے، جبکہ ہماری آبادی یورپ، امریکہ اور جاپان سے کہیں زیادہ ہے، لیکن پھر بھی سروے کے مطابق تمام مسلم سائنس دانوں اور انجینئروں کی تعداد صرف پچاس ہزار ہے، جبکہ مغربی ممالک میں تقریباً ایک کروڑ اعلی سائنس داں اور انجینئر کام کررہے ہیں، ایک چھوٹے سے ملک اسرائیل میں چالیس ہزار سائنس داں موجود ہیں اور یہی لوگ اسرائیل جیسے ملک کی ترقی وقوت کے ضامن ہیں۔مغربی ممالک میں ہر سال تقریباً ایک لاکھ کتابیں اور بیس ہزار مقالے شائع ہوتے ہیں، جبکہ مسلم ممالک میں صرف ایک ہزار کتابیں اور مقالے ہی چھپتے ہیں۔ترقی یافتہ ممالک اپنی آمدنی کا سات فیصد سائنس اور جدید ٹکنالوجی پر خرچ کرتے ہیں، جبکہ اسلامی ممالک صرف ایک فیصد پر ہی اکتفاء کرتے ہیں، حالانکہ ان میں سے اکثر قدرتی وسائل سے مالا مال ہیں، کاش کہ وہ ان قدرتی وسائل سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے تو آج مسلم دنیا کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔

بہر حال اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس بات پر غور وخوض کریں کہ ہم بھی دیگر قوم کی طرح ترقی کی راہ پر گامزن ہوں، جس طرح وہ سائنسی علوم حاصل کررہے ہیں اور سائنسی ایجادات میں سرفہرست ہیں، ہم سائنسی علوم کو فروغ دیں تاکہ ہم پسماندگی سے نکل کر ارتقاء کی راہ پر اپنی کمندیں ڈال سکیں۔

مولانا سید احمد ومیض ندوی
استاذ حدیث دار العلوم حیدرآباد

عالمِ انسانی کو درپیش ایک سنگین خطرہ

اس حسین وجمیل کائنات کا اصل دلہا حضرت انسان ہے۔رب کائنات نے کرہ ارض کے نظام کو بے پناہ توازن کے ساتھ اس لئے قائم کیا ہے تاکہ انسانی زندگی کو کسی طرح کا خطرہ لاحق نہ ہو۔کائنات کی ہر چیز میں مکمل توازن ہے۔سورج سے زمین کا فاصلہ اگر کمی بیشی کا شکار ہوتا تو روئے زمین پر زندگی کا تصور ممکن نہ ہوتا۔زمین ۲۴ گھنٹوں میں اپنے محور کے گرد ایک چکر پورا کرتی ہے۔اگر یہ وقت ۲۴ گھنٹوں کے بجائے ۳۰ ہو جائے تو اتنی تیز ہوائیں چلیں کہ لوگوں کو عذاب الٰہی کا خوف ہونے لگے۔اسی طرح اگر یہ وقت گھٹ کر ۲۰ گھنٹے ہو جائے تو نباتات کے لئے خطرہ پیدا ہو جاتا۔جس طرح کائنات کے سارے نظام میں حقیقی توازن ہے اس طرح ماحولیات میں بھی بھرپور توازن ملحوظ رکھا گیا ہے۔ماحول اور آب وہوا قدرت کے دو انمول تحفے ہیں۔آلودگی سے پاک آب وہوا اور صاف وشفاف ماحولیات اللہ کی بڑی نعمتیں ہیں۔حیرت ہے کہ جس آب وہوا کی پاکیزگی اور ماحول کی صفائی پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔حضرت انسان اس آب وہوا اور ماحول کو آلودگی سے دوچار کر کے آفتوں کو دعوت دیتا ہے۔اس وقت ماحولیاتی آلودگی ایک عالمگیر مسئلہ بن چکی ہے۔آلودگی کے معاملہ کو لے کر ساری دنیا پریشان ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ اقوام متحدہ کے مستقل ایجنڈے میں شامل ہے۔ماحولیاتی آلودگی کی سنگینی کا اندازہ ان عالمی کانفرنسوں سے کیا جا سکتا ہے جو گزشتہ کئی دہائیوں سے اقوام متحدہ اور دیگر عالمی اداروں کے زیر نگرانی ہوتی رہی ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں برازیل میں ”ماحولیات کے حوالہ سے کرہ ارض کا تحفظ“ کے زیر عنوان اقوام متحدہ نے دنیا کی پہلی سربراہ کانفرنس منعقد کی تھی جس میں ۱۲۰ سے زائد سربراہانِ مملکت اور قریب دس ہزار ماہرین ماحولیات اور سائنسدانوں نے شرکت کی تھی۔پھر اقوام متحدہ کے ماحولیات کے ادارے نے ۱۹۹۷ء میں ماحولیات کو بہتر بنانے کے فوری اقدامات کے لئے ارکان ممالک کو کیوٹو پروٹوکول دستاویز پیش کی تھی۔مئی ۲۰۰۷ء کی ابتدائی تواریخ میں ماحولیات ہی کے موضوع پر ایک کانفرنس بنکاک میں منعقد ہوئی جس میں ۱۲۰ رممالک کے نمائندے پانچ یوم تک گلوبل وارمنگ (عالمی حدت) کے موضوع پر مباحثوں میں حصہ لیتے رہے۔اپریل ۲۰۰۷ء میں ماحولیات کی سالانہ عالمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ۸۰۰ سے زائد ماہرین اور سائنسداں شریک رہے۔اس طرح ۲۰۱۰ء میں ڈنمارک کی راجدھانی کوپن ہیگن میں ۷ تا ۱۸ ر دسمبر عالمی ماحولیاتی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں ماحولیاتی اور موسمی تبدیلی پر خوب اظہار خیال کیا گیا۔انسانی زندگی کا اتلاف چاہے اس کی جو بھی شکل ہو قابل مذمت اور انتہائی افسوسناک ہے۔دنیا کے سارے ممالک دہشت گردی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں پر واویلا کرتے تھکتے نہیں۔دنیا کے کسی بھی ملک کے سربراہ کی جب دوسرے ملک کے سربراہ سے ملاقات ہوتی ہے تو سب سے بڑا زیر بحث مسئلہ دہشت گردی ہوتا ہے۔میڈیا اور اخبارات کے صفحات دہشت گردی کی

خبروں سے پر رہتے ہیں۔اس میں شک نہیں کہ دہشت گردی کی لعنت انسانی معاشرہ کے لئے کسی ناسور سے کم نہیں ہے۔لیکن کیا انسانی جانوں کے اتلاف کی وہ صورت بھی قابل مذمت ہے جسے ماحولیاتی آلودگی نے جنم دیا ہے؟ جس طرح دہشت گردی کے نتیجہ میں ہونے والی ہلاکتوں پر فکرمندی کا اظہار کیا جاتا ہے اسی طرح ان ہلاکتوں پر اظہار افسوس کیوں نہیں کیا جاتا؟ بڑھتی ہوئی ماحولیاتی آلودگی سے ہورہی آلودگی کے نتیجہ میں ہونے والی اموات کے حوالے سے گزشتہ دنوں ایک برطانوی طبی جریدے نے جو اعداد وشمار شائع کئے ہیں انہیں جان کر سب کے ہوش اڑ جائیں گے۔طبی جریدے ''دی لینسٹ'' کی رپورٹ کے مطابق ۲۰۱۵ء میں دنیا بھر میں آلودگی کی وجہ سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۹۰ رلاکھ تھی، جن میں ہندوستان کا حصہ سب سے زیادہ ہے جہاں ۲۰۱۵ء میں آلودگی اوراس سے پیدا ہونے والے امراض کے سبب ۲۵ رلاکھ افراد موت کا لقمہ بن گئے۔ یہ اعداد وشمار ایڈس، ملیریا اور ٹی بی جیسی مہلک بیماریوں سے ہونے والوں کی تعداد سے تین گنا زیادہ ہے۔آلودگی کے معاملہ میں دوسرے مقام پر چین ہے، جہاں ۱۸ رلاکھ لوگ آلودگی کی لپیٹ میں آ کر جان گنوا بیٹھے ہیں۔ یہ نتائج ۲ رسالہ منصوبہ سے اخذ کئے گئے ہیں جبکہ ہلاکتیں زیادہ تر متوسط اور کم آمدنی والے ممالک میں ہوتی ہیں۔ یہ وہ ممالک ہیں جہاں ایک چوتھائی اموات کی وجہ آلودگی ہوتی ہے۔ بنگلہ دیش اور صومالیہ سب سے متاثرہ ممالک میں شامل ہیں جبکہ برونئی اور سویڈن میں آلودگی سے متاثر ہوکر مرنے والوں کی تعداد سب سے کم ہے۔سروے رپورٹ کے مطابق برطانیہ میں آلودگی کے باعث ۵۰ ہزار اموات ہوئیں، جو کُل اموات کا ۸ فیصد ہیں۔۱۸۸ کی فہرست میں برطانیہ کا نمبر ۵۵ واں ہے تاہم امریکہ، جرمنی، فرانس، اسپین، اٹلی اور ڈنمارک سمیت بہت سے یوروپی ممالک اس فہرست میں برطانیہ سے اوپر ہیں۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مشرقی ایشیائی ممالک میں فضائی آلودگی خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے اور آئندہ ۳۰ ربرسوں میں فضائی آلودگی سے جملہ اموات کا یہاں نصف حصہ رہے گا۔رپورٹ میں مزید درج کیا گیا ہے کہ تیزی سے صنعتی ترقی کررہے ممالک میں آلودگی سے مرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔امریکہ میں ہونے والی ۵،۸ فیصد ہلاکتوں یعنی ایک لاکھ ۵۵ افراد کی موت کا سبب آلودگی سے جوڑا جاتا ہے۔آلودگی کے سبب ہونے والی اموات میں سب سے بڑا حصہ فضائی آلودگی (یعنی آلودہ ہوا، ٹرانسپورٹ انڈسٹری سے لے کر گھر میں چلنے والے چولہے) کا ہے۔تقریباً ۶۵ رلاکھ افراد کی موت خراب ہوا کی وجہ سے ہوتی ہے۔ دوسرا نمبر آلودہ پانی کا ہے جس نے ۱۸ رلاکھ افراد کی جان لی۔جبکہ کام کی جگہ آلودگی کے باعث ۸ رلاکھ اموات ہوئیں۔ رپورٹ کے مطابق کل ۹۲ فیصد اموات غریب ممالک میں ہوئیں جو کہ معاشی ترقی کے تیز عمل سے گزر رہے ہیں۔ ہر سال پوری دنیا ماحولیاتی آلودگی جنگ اور تشدد سے زیادہ لوگوں کی جانیں لے رہی ہے۔ یہ اسموکنگ، بھوک اور قدرتی آفات سے بھی زیادہ لوگوں کو موت کے منہ تک پہنچا دیا ہے۔ایڈس ٹی بی اور ملیریا تینوں مل کر بھی آلودگی سے زیادہ جان لیوا نہیں ہیں۔ حیات تک آلودگی کے سبب ہونے والے معاشی نقصان کا تعلق ہے تو آلودگی سے ہر سال تقریباً ۶ء۴ ٹریلین ڈالر کا نقصان ہورہا ہے جو عالمی اقتصادی نظام کا ۲،۶ فیصد ہے۔آلودگی کی اس سنگین صورتحال پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے نیویارک کے اسکول آف میڈیسن سے وابستہ پروفیسر فلپ لینڈ رگن نے کہا کہ آلودگی ماحولیاتی چیلنج سے بہت بڑا مسئلہ ہے۔ یہ ایک بڑا اور عالمی مسئلہ ہے جو انسانی صحت اور بہبود کے بہت سے پہلوؤں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ایک نجی ادارہ پیور ارتھ سے وابستہ

کارٹی سنڈیلا کا کہنا ہے کہ آلودگی غربت، خراب صحت اور معاشی نقصان کا باہمی طور پر گہرا تعلق ہوتا ہے۔ آلودگی سے بنیادی انسانی حقوق مثلاً جینے کے حق صحت، محفوظ کام اور اس کے علاوہ بچوں اور کمزوروں کی حفاظت کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

آلودگی صحت انسانی کے لئے انتہائی مہلک اور مختلف جان لیوا امراض کا سبب ہے۔ حالیہ عرصہ میں آلودگی کے سبب ہوئی زیادہ تر اموات غیر متعدی امراض کی وجہ سے ہوئیں جن میں ہارٹ اٹیک، اسٹروک اور پھیپھڑوں کا سرطان شامل ہیں۔ انسانی زندگی کی بقا کے لئے صاف شفاف ہوا ضروری ہے۔ جب ہوا آلودہ ہو جاتی ہے تو ہر سانس کے ساتھ جسم میں زہریلی ہوا داخل ہونے لگتی ہے اور داخل ہو کر اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ چونکہ جسم میں اس کی صفائی کا کوئی انتظام نہیں ہوتا، اس لئے وہ مختلف بیماریوں کا سبب بنتی ہے۔ سانس کے ذریعہ جسم میں داخل ہونے والی آلودگی کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دہلی میں پھیپھڑے کے امراض کے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ راجدھانی میں آلودگی اتنی بڑھ گئی ہے کہ کوئی نان اسموک نہیں رہا ہر شخص جسم میں اتنی آلودہ ہوا داخل کر لیتا ہے جو ۲۰۔۲۵ سگریٹ پینے کے برابر ہو۔ آلودگی کی وجہ سے سانس اور کینسر کی بیماریاں بڑھ رہی ہیں اور ہارٹ اٹیک کی شرح میں غیر معمولی اضافہ دیکھا جا رہا ہے۔ آلودگی کے سبب صرف اموات ہی نہیں ہو رہی ہیں بلکہ یہ صحت زمین اور پانی کو نقصان پہنچانے کے ساتھ دنیا کی معیشت پر بھی بوجھ بن رہی ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق آلودگی کی وجہ سے ہر سال ۲۹۳ لاکھ کروڑ کا نقصان ہوتا ہے، جو دنیا کی کل معیشت کا ۶،۲ فیصد ہے۔

آلودگی ایک عفریت ہے جو پورے عالم کو نگلنے کے لئے منہ کھولے کھڑا ہے۔ آلودگی کی وجہ سے موسمی بحران، ماحولیاتی تبدیلی اور گلوبل وارمنگ (عالمی حدت) جیسے سنگین خطرات لاحق ہو رہے ہیں۔ خدشہ ہے کہ عالمی حدت کے نتیجہ میں ہو رہی ماحولیاتی تبدیلی آبی وسائل پر موجود دباؤ کو تیز و تند کر دے۔ پہاڑ، برفستان اور برف کی چھوٹی چوٹیاں، تازہ پانی کی فراہمی میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ حالیہ دہائیوں میں عالمی حدت اور ماحولیاتی تبدیلی کے نتیجہ میں گلیشیروں کے حجم میں بڑے پیمانے پر کمی واقع ہوئی ہے۔ سائنسدانوں کے مطابق قطب شمالی پر منجمد برف کے پہاڑوں کی چوٹیاں پگھل رہی ہیں۔ گزشتہ چند سالوں کے دوران خشک سالی، بدترین غذائی بحران اور گلیشیروں کے پگھلنے کے سبب شمالی اور جنوبی امریکہ ایشیاء اور آسٹریلیا میں پانی کمیاب اور بعض مقامات پر نایاب ہونے لگا ہے۔ ماحولیاتی تبدیلی اور عالمی حدت کے سبب دنیا قلت آب کے مسئلہ سے دوچار ہو سکتی ہے۔ ماہرین کے مطابق برفانی تودوں کے پگھلنے کے نتیجہ میں بڑے پہاڑی سلسلوں میں پگھل کر آنے والے شہر میں پانی کی آمد میں کمی واقع ہوئی ہے۔ ایک سروے کے مطابق ۲۰۲۰ء میں آفریقہ میں ۷۵ سے ۲۵۰ ملین افراد کو ماحولیاتی تبدیلی کی وجہ سے قلتِ آب سے دوچار ہونا پڑے گا، برفانی تودوں کے پگھلنے سے سمندروں کی سطح آب میں بے تحاشا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحر الکاہل اور بحر اوقیانوس میں آنے والے شدید طوفانوں کے سبب پورے شہروں کا وجود خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ میکسیکو اور جنوبی ایشیاء کے ۱۸ ملکوں میں آنے والے لگاتار سیلابوں کی وجہ سے تا حال دسیوں لاکھ لوگ بے گھر ہو چکے ہیں۔ قطبین کی برف پگھلنے کے سبب نشیبی جزیرے بری طرح متاثر ہو سکتے ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی، غذائی سلامتی کے لئے خسارہ ثابت ہو سکتی ہے۔ خشک اور گرم خطوں میں ناقص غذا متاثرین کی تعداد میں

اضافہ کرسکتی ہے۔ جن آفریقی ملکوں کی زراعت بارش کے پانی پر منحصر ہے وہاں کی پیداوار ۵۰ فیصد تک کم ہونے کا خدشہ ہے۔ اتنا ہی نہیں ماحولیاتی آلودگی زمین پر مختلف انواع حیات کے وجود کے لئے خطرہ ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کے سبب ہر روز ۱۰۰ سے لگ بھگ جانوروں کی اقسام ناپید ہوتی جارہی ہیں۔

ماحولیاتی آلودگی کی اتنی ساری ہلاکت خیزیوں کے باوجود آج دنیا صنعتی ترقی کے نشہ میں چور ہوکر عام انسان کو درپیش اس سنگین خطرہ سے انحراف کررہی ہے۔ ہر سال زمین پر ۴۰ ہزار ٹن ٹھوس غلاظتیں بکھیری جاتی ہیں۔ زہریلے کیمیائی مادے استعمال ہوتے ہیں جس کے مہلک ناکارہ فضلے کو غریب آفریقی ملکوں کے ساحلوں پر پھینک دیا جاتا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور انسانی سرگرمیوں کے سبب ہم ہر سیکنڈ میں فٹ بال گراؤنڈ کے بقدر جنگلات سے محروم ہورہے ہیں۔ دنیا کے سمندروں اور دریاؤں میں روزانہ ہزاروں ٹن غلاظتیں بہاکر انہیں آلودہ کردیا جاتا ہے۔ آبی ذخائر میں پٹرولیم کے پھیلاؤ، لاکھوں آبی جانوروں کی زندگیوں کو خطرات سے دوچار کردیا ہے۔ آئے دن صنعتی فضلات اور ماحولیاتی تبدیلی کے سبب زمین کا بڑا حصہ ناکارہ ہوتا جارہا ہے۔ اس وقت دنیا کی نصف آبادی کو پینے کا صاف پانی تک میسر نہیں ہے۔

اس تشویشناک صورتحال میں کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ دنیا اس تعلق سے ہوش سے کام لے؟ دہشت گردی ہی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ دہشت گردی اور بھکمری سے زیادہ اموات ماحولیاتی آلودگی کے سبب ہورہی ہیں ۲۰۱۵ء میں پوری دنیا میں دہشت گردی سے ۲۸۳۲۸ اور جنگوں سے ایک لاکھ ۶۷ ہزار اموات ہوئیں۔ ہندوستان میں اس سال دہشت گردی کی وجہ سے ۷۲۲ لوگوں کی موت ہوئی جبکہ آلودگی کی وجہ سے ۲۵ لاکھ لوگ موت کی نیند سوگئے۔ اس ۲۰۱۵ء میں بھکمری سے دنیا بھر میں ۷۹۶ ملین اور ہندوستان میں سب سے زیادہ ۱۹۴ ملین ہلاک ہوگئے۔ ان اعداد وشمار سے صاف واضح ہوتا ہے کہ آلودگی انسانیت کی سب سے بڑی قاتل ہے۔ ہندوستان کے لئے یہ بات کس قدر تشویشناک ہے کہ آلودگی کی وجہ سے سب سے زیادہ اموات یہیں ہوئیں۔ صرف ایک سال ۲۰۱۵ء میں ۲۵ لاکھ لوگ آلودگی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ آلودگی سے متعلق برطانوی طبی جریدے کی حالیہ رپورٹ ہندوستان کے لے انتباہ ہے۔ ہندوستان آلودگی سے متاثرہ ممالک کی فہرست میں پہلے نمبر پر ہے۔ آلودگی سے متعلق تازہ رپورٹ بھی اس وقت سامنے آئی جب ملک میں دیوالی کا تہوار منایا جانے والا تھا۔ ماحولیاتی آلودگی کے پیش نظر سپریم کورٹ نے پٹاخوں کی خرید وفروخت پر پابندی عائد کی تھی۔ اس کے باوجود دہلی اور ملک بھر میں پٹاخے پھوڑنے میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ آلودگی کے مسئلہ پر باتیں بہت کی جاتی ہیں، عملی میدان میں کسی قسم کی پیش رفت نہیں ہوئی۔ گزشتہ دیوالی کو سب سے پہلے پٹاخے چھوڑنے سے دہلی کی آلودگی میں ۹ فیصد کا اضافہ ہوگیا تھا جو کہ دیوالی کی رات ۱۲ فیصد کو متجاوز کرگیا۔ آلودگی کے معاملہ میں حکومت کی سردمہری افسوسناک ہے۔ انتظامیہ پرانی گاڑیوں کو ہٹانے سے پس وپیش کرتا ہے۔ پولیوشن کنٹرول کے نام پر بنائے گئے دفاتر کا حال یہ ہے کہ شکایت درج کرنے کے لئے عہدیدار تک نہیں ملتے۔ اثر ورسوخ رکھنے والی فیکٹریوں کے مالکوں کے خلاف حکومت کچھ کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ ندیوں کی صفائی پر اربوں روپئے بہائے گئے، مگر گندگی میں کمی نہیں آئی۔ سوچھ بھارت کا نعرہ لگاکر کچھ علامتی کام کرلینے سے آلودگی سے

نجات ممکن نہیں۔آلودگی سے متعلق عوامی شعور کی بیداری بھی ضروری ہے۔

آلودگی کے حوالے سے جہاں تک اسلامی نقطہ نظر کی بات ہے کہ وہ بالکل واضح ہے۔اسلام پاک مذہب ہے پاکی کو آدھا ایمان قرار دیتا ہے۔احادیث میں گھروں کے صحنوں کو تک پاک صاف رکھنے کی تاکید ہے۔آبی ذخیروں میں نجاست کرکے انہیں آلودہ کرنے سے روکا گیا ہے۔اسلام میں شجر کاری کی ترغیب دی گئی ہے۔نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے"جو کوئی مسلمان درخت لگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے اوراس سے کوئی انسان، پرندہ یا جانور کھاتا ہے تو یہ لگانے والے کے لئے حصہ ہے۔"(بخاری) معروف امام اوزاعی کا قول ہے کہ درختوں کا کاٹنا مکروہ ہے کیونکہ حضرت صدیق اکبر نے کسی درخت کو کاٹنے خصوصاً پھلدار اور کسی عمارت کو برباد کرنے سے منع فرمایا کہ آپ کے بعد مسلمانوں نے اس پر عمل کیا (سنن ترمذی) قرآن مجید صاف کہتا ہے کہ خشکی وتری میں فساد وبگاڑ دراصل انسانی کرتوتوں کی وجہ سے آتا ہے۔قرآن، زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتا ہے۔اسلام ہر اس حرکت سے روکتا ہے جس سے صحت انسانی کو خطرات لاحق ہوتے ہوں۔ایک مسلمان شہری کو آلودگی کے حوالہ سے حساس ہونا چاہئے۔عالمی سطح پر آلودگی کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے عالمی طاقتوں کو مضر گیسوں کے اخراج میں کمی لانا چاہئے، نیز جنگلات کے تحفظ کو یقینی بنانا چاہئے۔شجر کاری اور نباتات کی افزائش پر خصوصی توجہ دی جائے، آبی ذخائر کو آلودہ کرنے سے گریز کیا جائے۔

تعارف واپیل

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد میں ۱۵؍جنوری ۲۰۱۷ء کو قائم کیا گیا تا کہ امت مسلمہ کے نونہالان زیور علم سے آراستہ ہوں اور ملک وملت کی خدمت میں وقف ہوجائیں۔اللہ رب العزت ان مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔آمین یارب العلمین۔

مدرسہ ہذا اقامتی غیر اقامتی ہے۔فی الحال اقامتی میں شعبہ ناظرہ،شعبہ حفظ،اردو،انگلش،حساب اور کمپیوٹر کی تعلیم کا عمدہ نظم ہے۔کیونکہ مدرسہ ہذا کو الحمدللہ ان علوم کے ماہرین کی خدمات حاصل ہے۔ان شاء اللہ مستقبل قریب میں مزید وسائل کے فراہم ہونے کی صورت میں درس نظامیہ اور مختصر مدتی عالم کورس،سیرت نبویؐ،تاریخ،دستور ہند وغیرہ کے شعبہ جات قائم کرنے کا ارادہ ہے اور ایسے افراد ان شاء اللہ تیار کرنا ہے جو عربی،انگلش،اردو زبان وغیرہ پر مکمل دسترس رکھیں،تاکہ ملک میں قومی یکجہتی اور بھائی چارگی کا بول بالا ہو۔اللہ رب العزت ان عزائم ومقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔آمین۔

مدرسہ ہذا اور ٹرسٹ کو کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔جملہ اخراجات کی ادائیگی اہل خیر حضرات کے تعاون سے ہوتی ہے،اور کوئی فیس طالب علموں سے نہیں لی جاتی ہے۔ایک طالب علم پر ماہانہ خرچ تقریباً ۱۵۰۰؍پندرہ سو روپے ہے۔فی الحال مدرسہ کا ماہانہ خرچ تقریباً ۵۰۰۰۰؍پچاس ہزار روپے ہے۔اس وجہ سے آپ تمام حضرات سے گزارش ہے کہ دامے درمے، سخنے،زکوۃ،صدقات،عطیات اور اشیاء جات سے تعاون فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔جزاکم اللہ واحسن الجزاء۔

Bank Name: IDBI
Ac Number: 1327104000065876
Ac Name: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBL0001327. Branch: Charminar

ڈاکٹر بی محمد داؤد محسنؔ

یم۔اے، پی ایچ۔ڈی

پرنسپال یس۔کے۔اے۔ایچ ملّت کالج

داونگرے۔577001 (کرناٹک۔انڈیا

موازنہ انیسؔ ودبیرؔ کا محاکمہ

شبلی ایک جید عالم، مورخ، مبصّر، مترجم، مدبّر، مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ سیرت نگار، سوانح نگار، شاعر، محقق اور ناقد بھی تھے۔انہوں نے کئی اصناف پر قلم اٹھایا اور ایک عہد کی نمائندگی کی۔ جہاں ان کی تصانیف کئی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں وہیں تنقیدات سے بھی مزیّن ہیں۔جن میں دو اہم کارنامے ''شعرالعجم'' اور ''موازنہ انیسؔ ودبیرؔ'' ہیں۔

شبلی نے جدید تنقید کی بنیاد میں غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے۔فن تنقید پر اگر چہ ان کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے، لیکن ان کی دو کتابیں اصول نقد کی بوطیقا یا بوستان کہی جا سکتی ہیں کیونکہ یہ ادبی تاریخ وتنقید کی گراں قدر دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ''شعرالعجم'' فارسی شاعری کی تاریخ ہونے کے باوجود ان کے تنقیدی تصورات ونظریات کی آئینہ دار ہے ،حالانکہ اس میں رجحانات اور ارتقا کو نہیں بلکہ مشاہیر کے تذکروں کو ملحوظ رکھا گیا ہے مگر یہاں بھی ان کے ذہن میں تقابلی تنقید کی بڑی اہمیت ہے۔ ''شعرالعجم'' میں بھی جا بجا اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔

" فردوسیؔ ، سعدیؔ اور نظامیؔ کے یہاں جو مضامین مشترکہ ہیں ان کا باہم موازنہ کرو۔بلاغت سے قطع نظر ، الفاظ کی شکوہ و شان اور ترکیبوں کی چستی اور نظم و نسق میں نظامیؔ کا کلام علانیہ ممتاز نظر آئے گا۔" (شعرالعجم جلد اول،ص ۳۰۵)

تنقید کا تقابلی انداز شبلی کا انفرادی اور پسندیدہ ہے جو صرف موازنہ تک محدود نہیں ہے۔وہ مشرق ومغرب کی ثقافت اور مختلف اشخاص کو بھی اسی زاویۂ سے دیکھنے کے عادی ہیں۔شعرالعجم میں تقابلی مطالعہ کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔

" فردوسیؔ ، سعدیؔ ، انوریؔ ، حافظؔ، عرفیؔ ، نظیریؔ بے شبہ اقلیم سخن کے جم و کے ہیں ، لیکن ان کی حدودِ حکومت ایك اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی۔فردوسیؔ مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا ، سعدیؔ قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے ، انوریؔ مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا، حافظؔ، عرفیؔ ، نظیریؔ، غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے ، لیکن خسروؔ کی جہاں گیری میں غزل ، مثنوی ، قصیدہ ، رباعی سب کچھ داخل ہے۔" (شعرالعجم جلد اول،ص ۱۳۳)

شعرالعجم سے ہٹ کر اگر " موازنہ " کے تعلق سے بات کی جائے تو یہ بات واضح ہے کہ شبلی نے "

موازنہ" کے ذریعہ انیسؔ شناسی کے لیے اہم کارنامہ انجام دیا اور تقابلی تنقید کے نمونے پیش کیے۔ اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ شبلی اردو تنقید کے ایوان و محل کے معماروں میں سے ایک ہیں۔ جنھوں نے تنقیدی اصولوں کے محل سرا آباد کیے اور نظریات سے قطع نظر تنقیدی اسالیب کی گزرگاہ کو روشنی بخشنے میں ہماری رہبری کی۔ ان کا یہ امتیاز ہے کہ انہوں نے اپنی تنقید کے ذریعہ قاری کو اصل متن پڑھنے پر آمادہ کیا جو کہ تنقید کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ شبلی کی نظر میں تخلیق اور قاری کے رشتے بڑے اہم ہیں اسی لیے تنقید میں قاری سے ان کا تخاطب، بہت معنی خیز ہے۔

اتنی بات تو سب جانتے ہیں کہ اردو شاعری میں انیسؔ اور دبیرؔ کے مرثیوں کا سرمایہ نہ ہوتا تو جدید نظم نگاری کی بنیاد اور ابتدا کا تصور محال تھا۔ شبلی نے ان شعراء کے مرثیوں کا جائزہ لینے کی ضرورت کی۔ حالانکہ اس سے قبل تذکرے لکھے گئے تھے مگر ان میں صرف غزل گو شعراء کو فوقیت دینے کا رواج عام تھا۔ اس کے علاوہ انیسؔ کے عقیدت مندوں نے ان کی رفعت و عظمت کا راز مرزا دبیرؔ کے موازنے، مقابلے اور مناظرے میں ہی محصور کرلیا تھا اور ان کے مرثیوں کو اعزاداری کا بہترین ذریعہ سمجھا تھا۔ لہٰذا ایک اہم مقصد کے تحت شبلی نے یہ کتاب لکھی۔ "جس کی وضاحت وہ اس کتاب کی تمہید میں اس طرح کرتے ہیں۔

"مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ یا تنقید لکھی جائے جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری باوجود کم مائیگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے۔ اس عرض کے لیے میر انیسؔ سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لیے موزوں نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے۔"

شبلی نے "موازنہ" لکھ کر مرثیے کو مجلس خوانی کی تنگ نائی سے نکال کر تنقید کی توقیر سے آشنا کیا اور عظمت سے ہم کنار کیا۔ انہیں کی بدولت مرثیہ نے مجلس سے نکل کر شعری انتقاد کے بلند مرتبے تک رسائی حاصل کی۔ یہ بات مشہور ہے کہ انیس و دبیر کے طرف داروں کے بیچ مناظرہ کا ماحول تھا۔ شبلی نے تصفیہ کردیا کہ انیسؔ کو دبیرؔ پر ترجیح حاصل ہے۔

موازنہ انیس و دبیر عملی تنقید کا نمونہ ہے۔ دراصل تنقید کا یہ انداز شبلی کی اختراع نہیں ہمارے پرانے نظام نقد و انتقاد میں ادبی گروہ بندیوں کے ماتحت مختلف شاعروں کی شاعری کی قدر و قیمت کا فیصلہ اور طریقوں کے علاوہ اس انداز سے بھی کیا جاتا تھا۔ شبلی نے بھی اس طریقے پر عمل کرتے ہوئے "موازنہ" کے ذریعہ تقابلی تنقید کی ایک ایسی بنیاد رکھی جس سے مختلف فن کاروں کے درمیان ایک اصولی گفتگو کا آغاز ہوا اور تقابل و توازن سے تنقید کو آشنائی حاصل ہوئی۔ اس کے باوجود شبلی سے پہلے ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ جس میں ایک ہی عہد کے دو فنکاروں کی قدر و قیمت کا تعین ان کی سخن وری کو میزان نقد پر رکھ کر کیا گیا ہو۔ حالانکہ اس سے قبل حالیؔ اور مولانا محمد حسین آزادؔ نے "مقدمہ شعر و شاعری" اور "آب حیات" میں مرثیہ نگاری اور مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا تھا مگر وہ اجمالی ہے۔ مجموعی حیثیت سے اس قدر تفصیلی بحث کسی

مورخ اور نقاد نے نہیں پیش کی تھی۔اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں۔

"آج میر انیسؔ کی شاعرانہ عظمت کا جو سکّہ ہمارے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے اور عام و خاص میں انہیں جو شہرت حاصل ہے ان میں سب سے زیادہ حصّہ مولانا شبلیؔ ہی کا ہے۔مولانا محمد حسین آزادؔ اور مولانا الطاف حسین حالیؔ نے میر انیسؔ کا تذکرہ ضمناً کیا تھا ۔مولانا شبلیؔ نے میر انیسؔ پر ایک بھر پور کتاب "موازنہ انیسؔ و دبیرؔ" کے نام سے لکھ دی۔میر انیسؔ کی شہرت "موازنہ" سے پہلے بھی تھی لیکن اتنی نہیں.....یہی حال دبیرؔ کا بھی تھا۔

(میر انیسؔ۔حیات اور شاعری.....ڈاکٹر فرمان فتحپوری ص ۲۳۴)

شبلیؔ حالانکہ تنقید کو صرف ادبی محاکمہ ہی نہیں گردانتے بلکہ اسے ایک باقاعدہ صنف ادب کے طور پر پیش کرنے کے متمنّی ہیں اور نقد و نظر کے مثبت پہلوؤں پر عام قارئین ادب کے اذہان کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔"موازنہ" میں شبلیؔ کے محاکمے کے اصول سائنٹفک ہیں۔انہوں نے سب سے پہلے شاعری کو پرکھنے کے صحیح اصول واضح کیے ہیں۔پھر دونوں شاعروں کی تقابلی اہمیت ان اصولوں کی روشنی میں ظاہر کی ہے۔کتاب کی ابتدا میں مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ،عربی اور فارسی مراثی کا جائزہ لیا ہے اور اس کے بعد فصاحت، بلاغت، روزمرہ اور محاورہ، الفاظ کا استعمال، صنائع و بدائع، بحروں کا انتخاب، استعارات و تشبیہات، حسن قافیہ ورد یف کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات و احساسات، واقعہ نگاری، منظر نگاری، رزمیہ اور بزمیہ شاعری کے موضوعات اور مطالبات پر بھر پور تبصرہ کیا ہے۔اسی طرح شاعری کے باب میں فصاحت و بلاغت کی تعریف، لفظوں کا محل استعمال، بندش وچستی، موزونیت اور افادیت سے علمی بحث کی ہے جس میں عربی اور فارسی شعراء کے حوالے کے ساتھ ساتھ اردو کے مستند شعراء کا بھی تذکرہ اور تبصرہ شامل ہے اور انیسؔ کے مرثیوں کے محاسن کے بعد رباعی اور سلام نگاری سے بھی مختصر گفتگو کی ہے۔ایک باب میں انیس پر اعتراضات وارد کیے ہیں اور "سرقات" کا عنوان بھی روا رکھا گیا ہے۔آخری صفحات میں میر انیسؔ اور مرزا دبیر کا موازنہ اور متحد المضامین اشعار بھی بحث میں لائے ہیں۔اس طرح شبلیؔ نے اردو مرثیہ نگاری کی جملہ خصوصیات کے ساتھ انیسؔ و دبیرؔ کی عظمتِ فن سے اربابِ فکر و نظر کو روشناس کرایا ہے۔

دراصل "موازنہ انیسؔ و دبیرؔ" میں دو شاعروں کے فن کو پرکھنا ترجیح اور سبقت کی بات نہ تھی بلکہ سخن شناسی کی ایک جہت تھی۔جس میں ان دونوں شعرا کے

تقابل کا سرا الفاظ کے انتخاب اور استعمال سے جا ملتا ہے۔مشرقی اصول نقد میں قدما نے لفظ و معنی کے ارتباط اور انتخاب پر بہت ہی محتاط اور فکر آفرینی گفتگو کی ہے۔لفظ و معنی کے باہمی ربط اور مناسبات پر فن کی پرکھ کے معیار قائم کیے گئے ہیں۔شبلیؔ لفظ کی اہمیت کے قائل دکھائی دیتے ہیں اور وہ "موازنہ" میں لفظوں کے موقع و محل اور طریقۂ کار پر جگہ جگہ گفتگو کرتے ہیں۔ایک ہی لفظ اپنے محل استعمال سے کہیں فصیح اور کہیں غیر فصیح بن جاتا ہے۔لفظ بذاتِ خود نہ فصیح اور نہ

غیر فصیح ہوتا ہے بلکہ محلِ استعمال اور معنی کی ادائیگی میں اس کی موزونیت کو دخل ہے۔اگر مناسبت سے خالی ہو تو لفظ شعری حسن پیدا کرنے میں ناکام ہوتا ہے۔ مستعمل لفظوں کے دروبست سے شعری محاسن میں اضافہ ہوتا ہے۔اس کی تاثیر بڑھ جاتی ہے اور قاری کے جذبہ واحساس کو سرشاری بخشنے کا موجب قرار پاتا ہے۔شعر اگر انبساط اور احساس کو فرحت بخشنے میں ناکام ہو تو بے معنی ہے۔لفظ و معنی کے حسنِ امتزاج سے فن سحر آفریں ہوتا ہے۔آمیزش سے آہنگ کی تشکیل ہوتی ہے۔یہ سرود وسحر کے موثرات کا حامل ہوتا ہے۔حالی بھی صحیح لفظ کی تلاش اور طریقہ کار پر گفتگو کرتے ہیں۔شبلی کی نظر میں بھی الفاظ کی ناگزیر معنویت ہے اور اس سے زیادہ اس کے استعمال اور انتخاب کی اہمیت ہے۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ شبلی نے انیس کی شاعرانہ عظمت کو اجاگر کرنے کے لیے ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھی۔ انہوں نے اردو زبان وشاعری کی وسعتوں کے امکانات کا پرتو کلام انیس میں دیکھا اور اردو شاعری کی جملہ اصناف کا اعلیٰ معیار انیس کے مرثیوں میں پایا۔اس کتاب کی اہمیت اس لیے ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے اردو شاعری میں صنفِ مرثیہ اور مرثیہ نگاروں کی خصوصیات وامتیازات کا واضح تذکرہ دیگر اصناف سخن کے ذیل میں تنقیدی اور تاریخی حیثیت سے کیا۔

''موازنہ'' کی افادیت واہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر شبلی اس کتاب کا نام ''موازنہ انیس و دبیر'' رکھ کر غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔کیونکہ اس میں انیس کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے دبیر پر نکتہ چینی کی گئی ہے اور تقابلی تنقید کے اصول و ضوابط برتنے میں وہ ناکام ہوئے ہیں۔شبلی ہر جگہ کلامِ انیس کے محاسن شعری کا دم بھرتے ہیں،اوصاف لکھتے جاتے ہیں اور جھومتے جاتے ہیں مگر دبیر کے کلام کا صحیح اور اصلی انتخاب پیش کرنے میں مجبور محض نظر آتے ہیں۔انیس کے کلام کی صفات بیان کرنے میں وہ کامیاب صاحب طرز انشاپرداز تو ضرور ثابت ہوئے ہیں لیکن تنقید نگاری کے مزاج اور معیار کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔وہ نظریاتی حدود اور ذہنی تعصبات سے بلند و برتر ہو کر ادبی اور فنی تجزیہ کرنے سے بھی قاصر ہیں اور وہ ہیرو پرستی کا شکار ہو کر اپنے انتقادی احتساب میں غیر جانبدار اور دیانت دار نہیں دکھائی دیتے۔بقول عبدالشکور

" نفسیاتی اعتبار سے وہ کامیاب ناقد نہیں ہو سکتے تھے۔فطرتاً" بت پرست" واقع ہوئے تھے۔ہیروورشپ کا ملکہ تھا۔جس شاعر کو پسند کرتے تھے اس پر عاشق ہوجاتے تھے۔ایسی صورت میں غیر جانبدار رہتے ہوئے ان سے عدل کی توقع کرنا بے سود تھا۔ان کی طبیعت میں فلسفے کا" لمس"بہت کم موجود تھا......ناقدین کے وزنی اور ٹھوس فرائض انجام دینا ان کا کام نہ تھا۔شبلی نے انیس کو ہیرو مان لیا ھے اور دبیر کے محاسن کا ذکر تک نہیں کیا ھے۔(تنقیدی سرمایہ:از عبدالشکور ص ۷۶)

شبلی کی تحریروں میں عموماً تضادات و تردیدات کا وصف پایا جاتا ہے۔انیس کے بیان میں بھی وہ کئی مقامات پر تضاد کا شکار ہوئے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ''انیس نے شاعری میراث میں پائی تھی اور ان کے مرثیوں کے خاص

جوہر میراث ہی کی یادگار ہیں۔'' جب کہ وہ انیسؔ کے دادا میر حسنؔ کے تعلق سے کہتے ہیں کہ ''میر حسنؔ واقعہ نگاری میں اکثر ابتذال پیدا کردیتے ہیں'' اس طرح دیکھا جائے تو ابتذال کلامِ انیسؔ کا خاص جوہر معلوم ہوتا ہے۔ ''موازنہ'' ہی میں نظیر اکبر آبادی کے تعلق سے کہتے ہیں کہ ''ابتذال کی صاف اور بیّن مثال نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے۔'' واقعہ نگاری اور اس کے حدود سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''نظیر اکبر آبادی کے کلام میں جو سوقیانہ پن ہے اس کا راز یہی ہے۔'' جب کہ واقعہ نگاری کی جو تعریف شبلی نے کی ہے اس کی بہترین اور کامیاب مثال نظیر اکبر آبادی کے کلام میں ملتی ہے۔ دراصل شبلی نے اپنی ذاتی پسندیدگی کو انتہا پسندی کی شکل میں پیش کردیا ہے۔

جہاں تک کلام انیس و دبیرؔ کے موازنے کا سوال ہے یہ بھی ایک مستند اور مدلل المیہ ہے کہ شبلی نے دبیرؔ کے مرثیوں کے وہ ٹکڑے اور حصے نہیں پیش کیے جو واقعی انیسؔ کے ہم پلّہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اس غیر محتاط تقابل میں شبلی سے فاش غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں۔ مثلاً بعض ایسے کلام کو دبیرؔ کا کلام کہہ کر نقل کیا ہے اور کلامِ انیسؔ سے موازنہ کیا ہے جو سرے سے دبیرؔ کا کلام نہیں ہے۔ مثلاً یہ مصرعہ...... ''زیرِ قدم والدہ فردوس بریں ہے'' دراصل ان کے شاگرد حکیم قدیر لکھنوی کا ہے۔ اسی طرح یہ مصرعہ ''ہے ہے میرے دیور، میرے دیور، میرے دیور'' اور یہ شعر ''جب خوں میں بھری فوج کے انبوہ سے نکلی غل یہ تھا کہ وہ لال پری کوہ سے نکلی'' ان کے کسی مطبوعہ مرثیے میں نہیں ملتا ہے۔ اس طرح شبلی اردو مراثی کی مفصل تاریخ اور مواد کا مطالعہ نہیں رکھتے اور تقابلی مطالعے کے لیے متن کی چھان بین اور صحت کی ضرورت محسوس کیے بغیر حوالے دیتے ہیں اور اپنی عدم واقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ شبلی نے کتاب کے آغاز میں مختصر تمہید اور سبب تالیف کے بعد فارسی اور عربی مرثیہ نگاری پر مختصر اور سرسری طور پر بحث کرتے ہوئے اردو مرثیہ کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔ جہاں وہ خود اعتراف کرتے ہیں۔ ''یہ معلوم نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا کس نے کی لیکن اس قدر یقینی ہے کہ سوداؔ اور میرؔ سے پہلے مرثیہ کا رواج ہو چکا تھا۔'' جب کہ حقیقت یہ ہے کہ دکن میں مرثیہ نگاری کا باضابطہ آغاز انیسؔ اور دبیرؔ سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ شبلی نے تاریخ اسلام بھی لکھی لیکن ایک مورخ کی حیثیت سے بھی ان کی تاریخی معلومات کچی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''عونؓ و محمدؓ کی روایت کا سرے سے کہیں پتہ نہ تھا لیکن جب انیسؔ نے اس کو مرثیہ میں لکھا تو تمام لوگوں کو اس کی واقعیت کا دھوکہ ہوا۔'' جب کہ عونؓ و محمدؓ کی تاریخ انیسؔ سے پہلے بھی ملتی ہے۔ ایک مقام پر وہ انیسؔ کو ترجیح دیتے ہیں اور دوسرے مقام پر اسی کیفیت کے اظہار میں دبیرؔ کو افضلیت عطا کردیتے ہیں۔ اکثر و بیشتر تو قاری بڑی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے کہ آخر وہ کیا فرمانا چاہتے ہیں اور کس کو ترجیح دے کر کس ادبی نکتے کے انکشاف و اکتشاف کا مقصد رکھتے ہیں۔ مثلاً ان دونوں کے فصاحت کلام کے ضمن میں لکھتے ہیں۔ ''مرزا صاحب کی شاعری میں بالفرض گو اور تمام اوصاف پائے جاتے ہوں لیکن بلاغت کا تو شائبہ نہیں پایا جاتا۔'' مگر فصاحت کے بیان میں لکھتے ہیں کہ ''بعض موقعوں پر مرزا دبیر صاحب نے جس بلاغت سے مضمون کو ادا کیا ہے میر انیسؔ صاحب سے نہیں ہو سکا۔'' اور پھر یہ کہ ''مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات و استعارات ہیں۔'' اور ایک جگہ

لکھتے ہیں ”مرزا صاحب نے اس مضمون کو نہایت خوبی اور صفائی سے ادا کیا ہے۔ میر انیسؔ نے اس مضمون کو کئی طرح سے پلٹا لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ بات نصیب نہ ہوئی۔“

اسی طرح شبلیؔ دونوں شعراء کی فصاحت کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ہی مضمون والے اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے میر انیسؔ کے کلام کو فصیح اور دبیرؔ کے کلام کو غیر فصیح قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ”اگر مرزا صاحب کے ہاں غریب اور ثقیل الفاظ ہوں گے تو ان کے مقابلہ میں میر صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہوں گے اور اگر مرزا صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہوں گے تو میر صاحب کے ہاں فصیح تر ہوں گے۔“

الفاظ و تراکیب کے استعمال کا بیان کرتے ہیں تو وہاں بھی انہیں انیسؔ کی بہ نسبت دبیرؔ کے ہاں ثقالت اور بھدّے پن کا احساس ہوتا ہے کہتے ہیں۔ ”بعض الفاظ بجائے خود ایسے ثقیل اور گراں نہیں، لیکن مرزا صاحب جن ترکیبوں کے ساتھ ان کو استعمال کرتے ہیں، ان سے نہایت ثقل اور بھدّا پن پیدا ہو جاتا ہے۔“

دبیرؔ کے استعارات و تشبیہات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”وہ ایسی عجیب اور نادر تشبیہات اور استعارات پیدا کرتے ہیں، جن کی طرف کبھی کسی کا خیال منتقل نہیں ہوا ہوگا۔“ مگر فوری طور پر ارادہ بدل دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ”لیکن اس زور میں وہ اکثر اس قدر بلند اڑتے ہیں کہ بالکل غائب ہو جاتے ہیں۔“

اس طرح کی کئی مثالیں ”موازنہ“ میں جا بجا ملتی ہیں جس میں شبلیؔ کے متضاد بیانات پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مسیح الزماں کہتے ہیں۔ ”موازنہ انیسؔ و دبیر“ میں شبلیؔ نے محقق اور ناقد دونوں حیثیتوں سے لغزشیں کی ہیں اور اس میں ان کی تحقیق اور رائے زنی کا وہ بلند معیار نظر نہیں آتا جو ان کے نام کے ساتھ وابستہ ہے۔“ (معیار ومیزان۔ ڈاکٹر مسیح الزماں ص ۲۴۴)

”موازنہ“ شبلیؔ کی ایک ایسی تصنیف ہے جو صنف مرثیہ اور خاص طور سے انیسؔ و دبیرؔ کے فن کو جذبات، معتقدات اور تعصّبات سے بلند ہو کر علمی و ادبی انداز و معیار سے افہام و تفہیم کی محرک بنتی ہے۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ”موازنہ انیس و دبیر“ دراصل موازنہ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں انیسؔ کی شاعری پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے ان کا ادبی مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کے لیے انہیں کے عہد کے شاعر مرزا دبیر کی شاعری سے موازنہ کر کے انیس کو بڑا ثابت کیا گیا ہے اور یہ بات عام ہے کہ کسی ایک کو بڑا ثابت کرنے کے لیے برابر والے دوسرے کو سامنے لا کر کھڑا کر دینا پڑتا ہے۔ شبلیؔ نہایت ذہین و فطین تھے اس لیے انیسؔ کا موازنہ دیگر شاعروں سے کرنے کے بجائے اسی صنف کے ماہر اور نامی گرامی پہلوان دبیرؔ کے ساتھ کیا اور فیصلہ صادر کر دیا۔ غالبؔ کو سمجھنے میں ”یادگار غالبؔ“ جتنی اہمیت رکھتی ہے اتنی ہی انیسؔ کے مطالعہ کے لیے ”موازنہ انیسؔ و دبیرؔ“ ایک تنقیدی کتاب ہونے کے باوجود ”مطالعۂ انیسؔ“ کہی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر حمران احمد معروفی۔ استاد شعبہ اردو ایم ایس کریٹیو اسکول حیدرآباد

شمس الرحمٰن فاروقی بحیثیت ترجمہ نگار

علمی وادبی دنیا میں شمس الرحمٰن فاروقی تعارف کے محتاج نہیں ہیں ۔ زبان وادب بالعموم ،تنقید کے میدان میں بالخصوص گراں قدر خدمات انجام دینے کی وجہ سے صرف ہندوستان ہی نہیں ، بیرونی ممالک میں بھی متعارف ہیں ۔ اردو زبان وادب اور تنقید سے متعلق تین درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہونے کا انہیں اعزاز حاصل ہے ۔ اس نابغۂ روزگار شخصیت کی پیدائش اتر پردیش کے ضلع پرتاب گڈھ کے گاؤں کالاکنگر ہاؤس میں ،۳۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو ہوئی ۔ ان کا آبائی وطن کوریا پار ضلع اعظم گڈھ ہے جواب ضلع مئو میں پڑتا ہے ۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اعظم گڈھ اور گورکھپور میں حاصل کی ۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد الہٰ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے ۱۹۵۰ء میں انگریزی ادب میں ایم ۔ اے کی ڈگری حاصل کی ۔ اس کے بعد کچھ برسوں تک ایس ۔ سی کالج ، بلیا اور شبلی کالج' اعظم گڈھ میں انگریزی کے لکچرر رہے ۔ شبلی کالج اعظم گڈھ میں ملازمت کے دوران' انہوں نے انڈین پوسٹل سروس کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے اور ۳۴ سال تک اس ملازمت سے وابستہ رہے ۔ اس ملازمت کے دوران انہوں نے نہ صرف غیر معمولی تنقیدی اور تحقیقی کام کیا بلکہ شعر وسخن اور افسانہ نگاری کے میدان میں شہرت حاصل کی اور آج ہمارے درمیان ایک ہمہ جہت شخصیت کے روپ میں موجود ہیں ۔

فاروقی صاحب کو اردو، انگریزی ، فارسی اور ھندی پر عبور حاصل ہے اور فرانسیسی زبان سے واقف ہیں ۔ ان زبانوں سے براہ راست واقفیت کی وجہ سے انہوں نے ان کے ادب، تہذیب ، شاعری، تنقید اور فکشن کا کما حقہ مطالعہ کیا ہے اور ان سے براہ راست استفادہ کیا ہے ۔ انہوں نے انگریزی زبان سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے 'ترجمہ کا عمل بہت نازک' مشکل اور پیچیدہ ہوتا ہے ۔ ساتھ ہی یہ کام بہت ذمہ داری اور دیانت داری کا متقاضی ہوتا ہے ۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کیلئے دونوں زبانوں کی باریکیوں پر مکمل دسترس کے ساتھ محاوروں ، استعاروں اور تمثیلات سے بھی واقفیت درکار ہوتی ہے اور ترجمہ کے لئے مترجم میں جن اوصاف وشرائط کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے وہ سب فاروقی صاحب میں موجود ہیں ۔

اسی لئے شمس الرحمٰن فاروقی اعلیٰ پائے کے مترجم ہیں ۔ انہوں نے تین دہائی قبل ارسطو کی Poetic کا شعریات کے عنوان سے ترجمہ اعلیٰ پائے کا کیا ۔ فاروقی نے جو تراجم کئے ہیں ان پر ترجمہ نہیں طبع زاد کا گمان ہوتا ہے لیکن انہوں نے ترجمہ کرنے میں معنیٰ کی رعایت کے ساتھ لفظی رعایت کو بھی مدنظر رکھا ہے ۔ ترجمے میں انہوں نے جہاں ضروری سمجھا اجتہاد سے کام لیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرا اصول ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ترجمہ حتی الامکان لفظاً اور معناً دونوں طرح اصل سے قریب رہے ۔ چنانچہ میں نے زیر نظر رسالہ میں بھی نہ تو محض خیال کو اپنے لفظوں میں ڈھال دیا ہے اور نہ لفظی ترجمہ کر دیا ہے بلکہ ترجمہ اور ترجمانی دونوں کی کوشش کی ہے'' ۔(۱)

ترجمے میں مذکورہ پہلوؤں کو بخوبی نبھانے کے لئے سب سے پہلے اصل زبان میں پیوست متن اور اس کی لفظی اور معنوی باریکیوں کو دریافت کرتے ہیں بعدۂ مہدوف زبان اور متن کے سانچے میں بازیافت کرتے ہیں۔ مترجم کی حیثیت سے ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے انگریزی زبان میں اردو شعر و ادب کے کئی معیاری تراجم کے ذریعہ مغربی دنیا کو اردو ادب سے روشناس کرایا ہے۔ انہوں نے مغربی مترجمین کی بھی اردو ادب کو انگریزی میں پیش کرنے کے کام میں مدد کی ہے۔ ''آب حیات'' کا انگریزی ترجمہ کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر Frances w, pritchette کے ساتھ مل کر کیا۔ انہوں نے منتخب فارسی شاعری کا خوب صورت انتخاب بھی انگریزی زبان میں The Brind in Fight کے عنوان سے پیش کیا ہے۔'

فاروقی صاحب نے اپنے اردو افسانوں کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ انہوں نے تعلیمی زندگی میں کیا تھا ان کا ابتدائی افسانہ ''دلدل سے باہر'' ۱۹۵۰ میں میرٹھ کے رسالہ ''معیار'' میں چھپا تھا۔ فاروقی نے ''دلدل کے باہر'' کے بعد ''سرخ آندھی'' لکھا جو سوویت یونین میں مذہب پر استبداد کے بارے میں تھا اور خود فاروقی نے اس افسانہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مگر وہ اردو افسانہ اور اس کا انگریزی ترجمہ ان کے پاس محفوظ نہیں رہا۔ جس کے تعلق سے فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

''اردو میں وہ افسانہ کہاں چھپا مجھے یاد نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں چھپٹ پٹ ترجمہ کر کے افسانے کا انگریزی عنوان The Scarlet Tempest رکھا۔ ٹائپ وغیرہ کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ ہاتھ سے لکھ لکھا کر میں نے افسانہ ان کے حوالے کیا اور میری توقع کے بالکل خلاف انہوں نے بھی پسند کیا اور اسی عنوان سے چھاپ دیا۔ بہر حال اب میرے پاس اس افسانے کا نہ اردو مسودہ ہے نہ انگریزی اور نہ الہ آباد یونیورسٹی کا وہ شمارہ جس میں چھپا تھا۔'' (۲)

مذکورہ بالا افسانوں کے علاوہ انہوں نے ''شب خون'' میں بہت سے اپنے اردو افسانوں کے تراجم اپنے قلمی ناموں سے شائع کیا جس کی بابت وہ خود لکھتے ہیں۔

''شب خون'' کا پہلا شمارہ بابت ماہ جون 1944ء میں شائع کر دیا۔ یہ مئی ۱۸۶۶ کا وسط تھا پہلے ہی شمارے میں کئی چیزیں میں نے ایسی شامل کیں جو لکھی تو میں نے ہی تھی لیکن ان پر نام کچھ اور تھا اور ان میں ایک شہرزاد بھی تھا جسے ایک بھیانک افسانے Terrorstary کے مترجم اور بھیانک افسانے پر ایک تنقیدی نوٹ کے مصنف کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا۔ شہرزاد کے بہت سے تراجم ''شب خون'' میں شائع ہوئے اور مقبول ہوئے (۳)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ فاروقی صاحب نے ترجمہ نگاری کے میدان میں بھی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ جس طرح سے فاروقی صاحب کی دیگر جہتوں پر تفصیل سے لکھا گیا ہے، ضرورت ہے کہ اس جہت پر کام کیا جائے تاکہ شمس الرحمٰن فاروقی بحیثیت ایک عظیم مترجم ادبی دنیا میں متعارف ہوں۔

---

(۱) رسالہ روشنائی کراچی، فاروقی نمبر، جلد چہارم، شمارہ نمبر۱۴، ص:۱۱۱ (۲) شمس الرحمٰن فاروقی 'سوار اور دوسرے افسانے'، ص:۱۵ (۳) شمس الرحمٰن فاروقی 'سوار اور دوسرے افسانے'، ص:۱۹

ارشد جمیل (ریسرچ اسکالر)
شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی

مولانا ابوالکلام آزاد اور تقسیم ہند، ''آزادی ہند'' کے حوالے سے

ہندوستانی سیاست کو جن باتوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا ان میں مذہب کا نام سب سے پہلے لیا جا سکتا ہے۔ مذہبی بنیادوں پر کھڑے ہونے والے مفکر، ہندوستانی سیاست کو مبینہ طور پر متاثر کرنے والے ثابت ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے پیچھے مذہب بھی بغاوت کی ایک اہم وجہ تھا۔ اس طرح مذہبی بنیادوں پر بننے والی تنظیموں نے بھی ملک کو متاثر کیا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی تشکیل سے ہندوستانی سماج کو ایک نئی جہت کی تبدیلی کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا ایک نیا دور بھی شروع ہوا۔ انگریزوں کو ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم و دائم رکھنے کے لیے ملک میں فرقہ وارانہ تنازعات کو بڑھاوا دینا بھی ضروری تھا، لہٰذا تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل کرنا ان کی مجبوری تھی۔ مولانا ایک کٹر مذہبی مسلمان ہونے کے باوجود کبھی بھی انہوں نے مذہب کی کوری تقلید یا مذہبی جانبداری کا رویہ نہیں اپنایا۔ اگرچہ کہ کانگریس کے اندر ہی ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو انھیں مسلم پرست مانتا تھا نیز انھیں مکمل وطن پرست تسلیم نہیں کرتا تھا۔ دوسری جانب مسلم لیگ والے انھیں پوری طرح کافر اور مسلم مخالف نیز ہندوؤں کا حمایتی مانتے تھے۔ اگر ہم غیر جانب دارانہ طور پر غور کریں تو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح غیر جانب دار اور درمیانی راہ اپنانے والے انسان تھے، وہ کسی بھی فریق کے حق میں نامناسب اور غیر عادلانہ جھکاؤ نہیں رکھتے تھے۔ وہ پوری طرح ایک قوم پرست، کانگریس کے باعمل، مضبوط، بااثر اور وفادار کارکن تھے۔ کارکن اور قائد دونوں ہی حیثیت سے انہوں نے کانگریس کے ہر پروگرام، ہر تحریک اور ہر فیصلے کو حتی المقدور متاثر کیا۔ مکمل قومی تحریک میں ان کا تعاون لاثانی و غیر معمولی تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ تحریک آزادی میں مہاتما گاندھی اگر تحریک کے محرک تھے تو مولانا تحریک کے اعلیٰ قائد کی حیثیت رکھتے تھے، اگر انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کر کے تحریک آزادی میں ایک ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلانے کا بیڑا نہ اٹھایا ہوتا تو شاید ہماری تحریک آزادی کی نوعیت کچھ اور ہی ہوتی۔ دراصل مولانا کانگریس اور لیگ کے جھگڑے کو ختم کرنا چاہتا تھے۔ لہٰذا انہوں نے لیگ کے لیڈروں کے سامنے تجویز رکھی تھی کہ لیگ اگر تین باتیں منظور کر لے تو لیگ اور کانگریس کا سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ وہ تین باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ لیگ مکمل آزادی کی بات تسلیم کرے۔
۲۔ آزادی کے حصول کے لیے کانگریس کے ساتھ وہ کام کرے۔
۳۔ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے مسلم لیگ ایک الگ تنظیم کی حیثیت سے قائم رہے۔

مسلم لیگ نے درج بالا باتوں کو منظور نہیں کیا۔ کانگریس اس بات کی کوشش کر رہی تھی کہ لیگ کے ساتھ اس کا سمجھوتہ ہو

جائے اور تعطل دور ہو جائے۔ کیوں کہ اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ ملکی مفاد کے لیے لیگ و کانگریس آپس میں سمجھوتہ کریں اور مکمل سنجیدگی و سچائی کے ساتھ ملک کی آزادی کو نصب العین بنا کر اس کے لیے ایمانداری کے ساتھ کام کرے اور کانگریس کا ساتھ دے۔ لیکن لیگ کانگریس کے خلاف انگریزوں سے فائدہ اٹھانے کی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ جب کہ مولانا لیگی اثرات کم کرنے کے لیے کانگریس و دیگر جماعتوں کے تعاون سے ہندو مسلم اتحاد کے قیام کے ذریعہ لیگ کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کے حق میں تھے تا کہ مسلمانوں کی نظر لیگ والوں سے ہٹ کر ان کی جانب ہو سکے۔ لیکن جناح کی ہٹ دھرمی، لیگ و کانگریس کے بیچ سمجھوتے میں حائل تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں لیگ نے لاہور تجویز پاس کر کے پاکستان کی مانگ کو ایک تحریری قوت عطا کر دی۔ لہٰذا اب مسلم لیگ کا نصب العین پاکستان کا حصول ہو گیا تھا۔ اس تجویز کے پاس ہونے کے باوجود بھی مولانا ہندو مسلم تعلقات کو ہموار کر کے لیگ اور کانگریس کے اختلافات دور کرنے میں لگے رہے۔ مولانا چاہتے تھے کہ لیگ تقسیم ہند کا ارادہ بدل دے، لیکن لیگ کی طرف سے دوستی یا سمجھوتے کے خلاف ماحول بنایا جا رہا تھا۔ لیگ کے ناگپور اجلاس میں مولانا کو کانگریس کا ''شو بوائے'' کہہ کر انھیں بے عزت کرنے کی مذموم کوشش کی گئی۔ کیوں کہ مولانا ایک مسلمان ہو کر بھی کانگریس کے صدر تھے، جناح کی نظر میں یہ کانگریس کی ساری قوم کی نمائندگی کرنے کے دعوے کا ثبوت نہیں تھا بلکہ محض ایک دکھاوا تھا۔ جب ۲۳ اپریل ۱۹۴۲ء کو راجہ جی راج گوپال آچاری کی قیادت میں مدراس قانون ساز اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے ایک تجویز پاس کر کے کانگریس ورکنگ کمیٹی سے اپیل کی کہ وہ لیگ کا مطالبہ (تقسیم) قبول کر کے جنگ عظیم میں برطانیہ کا ساتھ دے کر ملک کو امکانی بحران سے نجات دلانے کے لیے قومی حکومت بنائے تو مولانا نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا، انہوں نے اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس بات سے انھیں بہت تعجب اور رنج ہوا ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ممبر ہوتے ہوئے راجہ جی نے ایسا نقطہ نظر اپنایا ہے۔ مولانا ایسے واقعات سے ہمت ہارنے والے نہیں تھے وہ مسلسل لیگ اور کانگریس میں صلح کرانے میں مصروف تھے۔ ۷، ۸ اگست ۱۹۴۲ء میں بمبئی میں ہونے والی کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں اس بات کا ذکر کیا گیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جائے۔ کیوں کہ کانگریس صرف اپنے لیے نہیں سب کے لیے اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی نے جناح کے ساتھ پھر گفتگو شروع کی اس وقت جناح راجہ رام جی کی تجویز منظور کرنے کے لیے تیار تھے لیکن جناح کا خاص زور اس بات پر تھا کہ پہلے پاکستان کی مانگ تسلیم کر لی جائے، ملک کی تقسیم پہلے ہو اور آپسی مفاد پر معاہدے کی گفتگو بعد میں۔ اس کے علاوہ دیگر اور بھی وجوہات تھیں جس کے سبب یہ گفتگو بھی نامکمل رہی۔ مولانا نے جناح کی پہلے تقسیم اور بعد میں آپسی مفاد پر معاہدے کی گفتگو کو شادی سے قبل ہی طلاق کا نام دے کر اپنی نامنظوری ظاہر کی تھی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لیگ و کانگریس کے سمجھوتے کے امکانات مکمل کوشش کے باوجود کئی بار ٹوٹ چکے تھے بلکہ ختم ہو چکے تھے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان آمد کے ساتھ ہی ہندوستانی تاریخ کے نئے باب یعنی تقسیم کے منصوبے کا دور شروع ہوا۔ ماؤنٹ بیٹن لندن سے مشورہ اور ان کو کوئی اطلاع دیے بغیر اپنے فیصلے کو نافذ کرنے کا اختیار لے کر ہندوستان آئے تھے۔ وہ اپنے ذہن میں ہندوستان کے مستقبل (تقسیم) کا ایک طے شدہ نقشہ لے کر لندن سے آئے تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ماؤنٹ

بیٹن کے دماغ میں ایک واضح خاکہ تقسیم ہنداور آزادی ہند کا پہلے سے موجود تھا، کیوں کہ اپنی پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے جواہر لعل نہرو سے کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے انگریزی حکومت کا خاتمہ کرنے والا آخری وائسرائے نہ سمجھیں، بلکہ نئے ہندوستان کا راستہ بنانے والا پہلا وائسرائے جانیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے کانگریس کے لیڈروں اور جناح کے خیالات و جذبات کو سمجھتے ہوئے ہندوستان آنے کے صرف بیس دن بعد بٹوارے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کام شروع کر دیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کی پرانی جان پہچان ان کے وائسرائے بن کر آنے کے بعد قریبی دوستی میں بدل گئی تھی، اپنی پہلی ملاقات میں ہی دونوں نے ایک دوسرے کی اہمیت و معاونت کو سمجھ لیا تھا۔ جب ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستانی ماحول میں فرقہ وارانہ منافرت وعداوت کو نزدیک سے دیکھا تبھی انہوں نے اس کے اہم کردار کو بھی دل میں اتار لیا تھا۔ عبوری حکومت میں لیگ کا کانگریس کے پروگراموں کو پورا نہ ہونے دینے کے لیے روڑا اٹکانے والی پالیسیوں نے انھیں اس ضمن میں اور زیادہ گہرائی سے جاننے کا موقع فراہم کیا تھا۔ ملک کے سیاسی حالات نے بیسویں صدی کے ہندوستان کو دو سیاستدانوں اور ایک غیر ملکی حکمراں کو تقریباً ایک ہی راستے پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن اگرچہ کہ پہلے ہی تقسیم کا منصوبہ بنا کر ہندوستان آئے تھے تو نہرو بھی ان کی آمد سے پہلے مشرقی بنگال کو ہندوستان سے الگ کر دینے کا فیصلہ ذاتی طور پر لے چکے تھے۔ ۲۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو ہی نہرو نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ لیگ پاکستان لے سکتی ہے صرف اس شرط پر کہ وہ ہندوستان کا ایسا کوئی اور حصہ نہ لے جو پاکستان میں شامل ہونا چاہتا ہو۔ ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان آمد کے ایک ماہ کے اندر ہی مسز ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اثر سے نہرو کھلے طور پر تقسیم کی حمایت کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔ جہاں تک سردار پٹیل کا تعلق ہے عبوری حکومت میں لیگ کے ذریعہ پیدا کی گئی پریشانیوں سے نجات پانے کے لیے دسمبر ۱۹۴۶ء کے آخر میں حکومت ہند کے ریفارم کمشنر بی پی مینن سے سردار پٹیل کی بات ہوئی تھی تب مینن نے بہت ہی صاف لفظوں میں پٹیل سے کہا تھا کہ انھیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مطالبہ پاکستان کو بہت سے بااثر انگریزوں کی حمایت حاصل ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ ہندوستان کے بڑے فوجی افسروں کی انھیں تائید حاصل ہے۔ اس لیے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آہستہ آہستہ خانہ جنگی کی جانب بڑھنے کے بجائے تقسیم کو تسلیم کر لینا ہی مناسب ہوگا۔ اگر ہم لوگ تسلیم کے لیے راضی ہو جائیں تو جناح بنگال و پنجاب نیز آسام کے وہ علاقے مانگ ہی نہیں سکتے جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہے۔ مینن کی بات کا یقین کرتے ہوئے پٹیل نے ان کی یہ بات مان لی تھی کہ منقسم ہندوستان میں دو مرکزی حکومتوں کا ہونا ہی سب سے اچھا رہے گا اور اس کی بنیاد نو آبادیاتی حکومت ہی ہو سکتی ہے۔ مینن کے ذریعہ سمجھائے گئے پس پردہ حالات جاننے کے بعد پٹیل نے اپنا ذہن اس بات کے لیے تیار کر لیا تھا کہ لیگ کو الگ حصہ ہندوستان میں سے دے دیا جائے تاکہ لیگ اپنی سرکار الگ بنا سکے۔ جب مولانا کو یہ بات معلوم ہوئی کہ پٹیل تقسیم کے لیے راضی ہو گئے ہیں تب مولانا نے ان سے ملاقات کر اپنا نظریہ سمجھانے کی کوشش کی۔ مولانا کے لفظوں میں درجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

”میں نے ان سے کہا کہ اگر ہم بٹوارے کے لیے راضی ہو گئے تو ہم ہندوستان کے لیے ایک مستقل مسئلہ پیدا کر لیں گے۔ بٹوارے سے فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہ ہوگا بلکہ اس ملک میں یہ ہمیشہ کی چیز بن جائے گی۔ جناح نے دو قومی نظریہ کا نعرہ بلند کیا ہے، بٹوارہ مان

لینے کا مطلب ہے اس نعرے کو مان لینا۔ کانگریس ہندو اور مسلمان کی بنیاد پر ملک کا بٹوارہ کرنے کی بات کو کیسے مان سکتی ہے۔ فرقہ وارانہ خوف دور کرنے کے بجائے بٹوارہ فرقہ وارانہ منافرت کی بنیاد پر دو حکومتوں کو جنم دے کر اسے دائمی بنا دے گا، ایک مرتبہ اگر نفرت کی بنیاد پر حکومتوں کا جنم ہو گیا تو حالات کہاں لے جائیں گے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

لیکن پٹیل جو تقسیم قبول کرنے کے لیے اپنی رضامندی ظاہر کر چکے تھے انہوں نے صاف طور پر کہا کہ۔

"آپ لوگوں کو بھلا لگے یا برا ہندوستان میں دراصل دو قوم ہیں"۔ انہوں نے اپنے قول کی حمایت میں مزید یہ بھی کہا کہ "اگر دو بھائی ساتھ نہیں رہ سکتے تو علیٰحدہ ہو جاتے ہیں، اپنا اپنا حصہ لے کر الگ ہو جانے پر وہ پھر دوست بن جاتے ہیں۔ دوسری جانب اگر انھیں زبردستی ساجھے میں رکھا جائے تو وہ روز لڑتے جھگڑتے ہیں، روز کی چخ چخ سے یہ اچھا ہے کہ ایک بار اچھی طرح جھگڑ لو اور الگ ہو جاؤ۔"

بالآخر مولانا نے نہرو کو تقسیم کی مخالفت کا مشورہ دیا تو نہرو نے لیگ کے ساتھ سرکار چلانے میں پیش آمدہ اپنے تلخ تجربات کی بنیاد پر تقسیم کی حمایت کرتے ہوئے جواب دیا کہ۔

"انتظامی کونسل میں لیگی اراکین کے رویے کا جو تجربہ مجھے حاصل ہوا ہے اس کے بعد مجھے ان کے ساتھ مل کر کام کر پانے کی کوئی امید نہیں رہی، ہم لوگوں کی رائے کسی بھی مسئلے پر تو نہیں ملتی، ہر روز تکرار ہوتی ہے۔ لہٰذا بٹوارے کی بات مان لینے میں ہی عافیت ہے۔"

مولانا کے مطابق جب انہوں نے گاندھی جی سے بٹوارہ منظور نہ کرنے کے سلسلے میں کہا تو صرف گاندھی جی نے تقسیم کے خلاف صاف طور سے مولانا کو جواب دیا کہ "اگر کانگریس بٹوارے کو قبول کرنا چاہتی ہے تو اسے میری لاش سے گزرنا ہوگا۔ جب تک میں زندہ ہوں میں کبھی ہندوستان کا بٹوارہ قبول نہیں کروں گا اور جہاں تک میرا بس چلے گا کانگریس کو بھی بٹوارہ قبول نہیں کرنے دوں گا۔"

مولانا اپنی کتاب "آزادی ہند" میں لکھتے ہیں کہ۔ "گاندھی جی سردار پٹیل سے ملنے کے بعد بدل گئے تھے اور جب میں دوبارہ ان سے ملا تو میں نے پایا کہ وہ بدل گئے ہیں۔ وہ کھلے طور سے بٹوارے کے حق میں تو نہیں ہوئے تھے لیکن وہ اتنے زور سے بٹوارے کی مخالفت بھی نہیں کر رہے تھے۔"

مولانا مزید آگے رقم طراز ہیں کہ گاندھی جی سے بھی مایوس ہونے کے بعد میں نے بٹوارہ روکنے کے لیے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی۔ "اس ملاقات میں میں نے کیبینٹ مشن کے منصوبے کو زندہ رکھنے کی اپیل کی اور کہا کہ ہم لوگوں کو صبر سے کام لینا چاہیے، کیوں کہ اس کے کامیاب ہونے کی اب بھی امید ہے، اگر ہم نے جلد بازی سے کام لیا اور تقسیم کے لیے راضی ہو گئے تو ہم ہندوستان کو مستقل نقصان پہونچائیں گے۔ ملک تقسیم ہو گیا تو پتہ نہیں اس کا کیا ردعمل ہوگا اور پھر بڑھتے ہوئے قدم واپس لوٹا لینے کا کوئی راستہ نہ رہ جائے گا۔"

مولانا نے تقسیم ہند کو روکنے کے حوالے سے ماؤنٹ بیٹن کو سمجھانے میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ۔

"کانگریس اب تک اس بات پر زور دیتی تھی کہ ہندوستان کو فوراً آزاد کر دیا جائے۔ اب کانگریس ہی یہ کہہ رہی ہے کہ اس سیاسی مسئلہ کا

حل ایک دو سال تک کے لیے ٹال دیا جائے۔" مولانا نے آگے لکھا ہے کہ "لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مجھے یقین دہانی کرائی تھی کہ میں حالات کی پوری پوری اور سچی تصویر برٹش کابینہ کے سامنے رکھ دوں گا۔ اور پچھلے دو مہینوں میں میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا ہے اس کا ایمانداری سے ذکر کروں گا اور کابینہ کو یہ بھی بتادوں گا کہ کانگریس کا ایک اہم حصہ ایسا بھی ہے جو یہ چاہتا ہے کہ اس مسئلہ کا حل ایک دو سال کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ مسٹر ایٹلی اور مسٹر کرپس کو یہ بھی بتادیں گے کہ اس معاملے میں مولانا آزاد کا خیال کیا ہے۔"

افسوس کی مولانا آزاد کی درج بالا ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ جو منصوبہ بی پی مینن نے تیار کیا تھا ماؤنٹ بیٹن نے اسے ہی آگے بڑھایا۔ وہ اس بات پر اتنا پختہ خیال ہو چکے تھے کہ مولانا کے ذریعہ تقسیم شدہ ملک کے الگ الگ حصوں میں خون کی ندیاں بہنیں اور ہلاکت انسانی کی ذمے داری انگریزوں کے سر ہونے کی بات کہنے کے باوجود انہوں نے فوراً جواب دیا کہ "کم از کم اس سوال پر میں آپ کو مکمل یقین دلا سکتا ہوں کہ یہ میری ذمے داری ہوگی کہ کوئی خون خرابہ اور فساد نہ ہو۔ میں فوجی ہوں غیر فوجی نہیں۔ ایک بار بٹوارہ اگر اصولی طور پر مان لیا جائے تو میں ایک حکم نامہ جاری کر اس بات کا مکمل انتظام کروں گا کہ ملک میں کہیں بھی فرقہ وارانہ فسادات نہ ہوں۔"

افسوس کہ ماؤنٹ بیٹن کے اپنے منصوبہ پر عمل کرنے کے لیے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی ہولناکی کا استعمال ایک ایسے ذریعہ کی شکل میں کیا گیا جس سے کی وہ کانگریسی لیڈروں کو تقسیم کی فوری ضرورت کی اہمیت کو سمجھا سکیں۔ دوران فساد مسز ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن جب فساد زدہ علاقوں کا دورہ کر کے لوٹیں تھیں تب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواہر لعل نہرو کے پاس اسی حربے کا استعمال کرنے بھیجا تھا۔ ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن نے نہرو کے پاس جا کر ملک کے موجودہ حالات کے حوالے سے تقسیم کی ناگزیریت کو سمجھانے کی کامیاب کوشش کی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن، جواہر لعل نہرو، اور سردار پٹیل تینوں تقسیم کے راستے پر ہی آگے بڑھ رہے تھے۔ پٹیل اور نہرو حالات کی مجبوری سے اور ماؤنٹ بیٹن اپنے مشیر کاروں، اپنی بیوی اور بیٹی کی مدد سے تقسیم کے فیصلے کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

۱۹۴۶ء میں برٹش سرکار کے ذریعہ کیبینٹ مشن کو ہندوستان بھیجنے سے ہندوستانی سیاست کے مسئلے کی حل کی نئی شروعات ہوئی تھی۔ اس مشن کے ساتھ ہونے والی بات چیت میں مولانا آزاد نے کانگریس کی نمائندگی کی تھی، انہوں نے کیبینٹ مشن کو یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان کے لیے مکمل آزادی سے کم کچھ بھی منظور نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ پاکستان کا قیام ہندوستانیوں کے مسائل کا حل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انہوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ہندوستان کو ایک رکھتے ہوئے صوبائی حکومتوں کو زیادہ سے زیادہ اختیار دے کر سارے مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔ کیبینٹ مشن نے ان کی بات منظور کر لی تھی اور اپنی جانب سے تقریباً ویسا ہی منصوبہ پیش بھی کیا تھا، لیکن مسلم لیگ کے ذریعہ فرقہ وارانہ بنیاد پر لیگ و کانگریس کو نمائندگی دیے جانے کے مطالبہ کرنے پر سارا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا، مولانا نے بھی فرقہ وارانہ بنیاد پر کوئی منصوبہ ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ مسلم لیگ کے مطالبات منظور نہ کیے جانے سے لیگی لیڈران رنجیدہ ہو گئے لہٰذا انھوں نے سیدھی کاروائی کے نام پر خون خرابے کا راستہ اپنا لیا۔ مولانا نے لیگ کی اس کاروائی کی مذمت کی

بلکہ اسے غیر اسلامی حرکت قرار دیا۔ مولانا ۱۹۴۶ء میں کانگریس کے عہدہ صدارت سے آزاد ہو گئے تھے ان کی جگہ پر جواہر لعل نہرو کو کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔ سابق صدر کانگریس ہوتے ہوئے بھی مولانا ہندوستان کی آزادی اور اس کی سالمیت کے تئیں بیدار و خبردار تھے۔ جب وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ملک کو تقسیم کرنے یا نہ کرنے پر غور کر رہے تھے تب بھی مولانا نے ان سے مل کر یہ کہا تھا کہ ملک کا بٹوارہ ملک کے لیے سنگین مسائل پیدا کرے گا لہٰذا تقسیم کو روکنا ہی بہتر ہوگا۔ مگر افسوس کہ مولانا کی یہ ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ مولانا نے متعدد مرتبہ مہاتما گاندھی اور نہرو کو بٹوارہ قبول نہ کرنے کے حق میں اپنے نظریات و خیالات سے قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ گاندھی جی خود بھی تقسیم کے حق میں نہیں تھے لیکن جواہر لعل نہرو، سردار پٹیل، گووندھ ولبھ پنتھ جیسے لیڈروں کے سامنے وہ اپنی بات منوانے سے قاصر رہے اور کانگریس کی کثرت آراء کے سامنے مولانا نے بھی گاندھی جی کی طرح اپنے ہتھیار ڈال دیے ،گرچہ کہ کبھی وہ دل سے تقسیم کو قبول نہیں کر سکے۔

تقسیم سے قبل ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور ملک کی تقسیم سے مولانا کو شدید تکلیف پہونچی تھی تبھی انہوں نے ایسوسی ایٹیڈ پریس کے نمائندے سے کہا تھا کہ۔ ”نہ تو میں ہندوستانی کی حیثیت سے اور نہ ہی ایک مسلمان ہونے کے ناطے اسے پسند کرتا ہوں۔“ مولانا کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ملک کو تقسیم کرنے سے سبھی ہندوستانیوں خاص طور سے مسلمانوں کو بہت نقصان ہوگا۔ اپریل ۱۹۴۶ء میں انہوں نے ایک بیان میں اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا کہ۔ ”مسلم لیگ نے پاکستان کا جو منصوبہ تیار کیا ہے اس پر میں نے ہر امکانی نظریے سے غور کیا ہے۔ ایک ہندوستانی کے ناطے میں نے یہ بات جانچی پرکھی ہے کہ پورے ہندوستان کے مستقبل پر اس کا اثر پڑ سکتا ہے۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں نے غور کیا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ منصوبے کے سبھی پہلوؤں پر غور و خوض کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ وہ نہ صرف سارے ہندوستان کے لیے نقصان دہ ہے بلکہ مسلمانوں کے لیے خاص طور سے ہلاکت خیز ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس سے جتنے مسائل ہوتے ہیں اس سے کہیں زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو میں یہ کہوں کہ یہ پاکستان لفظ ہی مجھے کچھ جچتا نہیں ہے۔ اس میں کچھ اس طرح کا مفہوم ہے کہ دنیا کے کچھ حصے تو پاک ہیں اور کچھ حصے ناپاک۔ زمین کو اس طرح پاک اور ناپاک حصوں میں بانٹنا ہی اسلام کے خلاف ہے۔“

تقسیم پاکستان کے نقصانات کو سمجھاتے ہوئے مولانا مزید فرماتے ہیں۔ ”اس سے ہندوستان میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان رہ جائیں گے جو ملک بھر میں چھوٹی چھوٹی تعداد میں بکھرے ہوں گے۔۔۔۔۔۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جب آج کا جوش ختم ہو جائے گا تو وہی لوگ جو آج پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں مسلمانوں کے مفاد کے لیے نقصان دہ بتا کر اسے نامنظور کریں گے۔“

قیام پاکستان کے بعد مولانا خوش نہیں رہتے تھے انہوں نے اپنے غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ۔ ”سچ تو یہ ہے کہ اس بارے میں جتنا سوچتا ہوں اتنا ہی مجھے یقین ہوتا ہے کہ پاکستان بن جانے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اتنے بگڑ گئے تھے کہ بٹوارے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے زیادہ تر حمایتیوں کا خیال یہی تھا اور بٹوارے کے بعد بہت سارے کانگریسی لیڈروں کا بھی یہی خیال رہا ہے۔ بٹوارے کے بعد جب کبھی میں نے جواہر لعل یا

سردار پٹیل سے اس بارے میں بات کی تب انہوں نے بھی اپنے فیصلے کی تائید میں ہمیشہ یہی دلیل دی۔لیکن اگر ہم اس معاملے پر ٹھنڈے دماغ سے سوچیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کا تجزیہ صحیح نہیں ہے۔"

مولانا بٹوارے کی جگہ پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی میل جول کو مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی سب سے بڑی گارنٹی مانتے تھے ان کی نگاہ میں دونوں فرقوں کے بگڑے ہوئے تعلقات کا حل یہ تھا کہ ہندو اکثریتی صوبوں کے ہندو اپنے صوبے کے مسلمانوں کی اور مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمان اپنے صوبے کے ہندوؤں کی حفاظت کریں۔اسی لیے پاکستان کی مانگ کو انہوں نے کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔مولانا نے دونوں فرقوں کے اتحاد کے لیے اپیل کرتے ہوئے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد، دلی میں مسلمانوں کے ایک جلسے میں دوران تقریر کہا تھا کہ "ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو۔یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔لیکن تم نے سنی ان سنی برابر کر دی، مجھے آج جو کچھ کہنا ہے بے روک ٹوک کہنا چاہتا ہوں کہ متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔"

ملک کا بٹوارہ ہونے کے باوجود بھی انھیں یقین تھا کہ یہ بٹوارہ ختم ہو جائے گا۔ایک صحافی مسٹر ڈی ایف کراکا سے انہوں نے کہا تھا کہ "ہندوستان میں چالیس لاکھ مسلمان رہیں گے اور پاکستان میں پچیس لاکھ ہندو رہیں گے، جہاں وہ پیدا ہوئے ہیں وہیں انھیں رہنا ہوگا، وہ دراصل ایک ہی عوام ہیں، وہ لمبے عرصے تک ساتھ رہے ہیں، انھیں پھر پاس پاس آنا ہوگا۔"

مولانا کو تقسیم کا یقیناً بے حد صدمہ تھا کہ ان کی انتہائی مزاحمتوں کے باوجود ملک تقسیم ہوا اور لاکھوں انسان تباہ و برباد اور جاں بحق ہوئے۔لیکن ملک کی تقسیم کے بعد وہ برصغیر میں امن و آشتی کے سب سے بڑے علمبردار اور صلح کل و بقائے باہم کے طلبگار بھی رہے۔انھوں نے آزادی کے بعد ہندوستان کی تعمیر نو اور مستقبل کا خاکہ بنانے میں بہت اہم رول ادا کیا۔وہ بخوبی جانتے تھے کہ اس ملک میں جہاں پانچ سو سے زیادہ بولیاں بولی جاتی ہیں، بھانت بھانت کی رسمیں اور مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ رہتے ہیں۔ ،اس ملک کی مختلف تہذیب و ثقافت کی ایک طویل اور رنگ برنگی تاریخ ہے اگر اس کو کسی ایک شیرازے میں باندھ کر رکھا جا سکتا ہے تو وہ قومی اتحاد و یکجہتی، سیکولرزم اور باہمی رواداری کی ڈور ہی ہو سکتی ہے۔اس کے لیے انہوں نے رہنما خطوط بھی بنائے اگر ہم ہوش کے کانوں سے سنیں تو اس مرد مجاہد کی وہ دور افتادہ صدا آج بھی فضا میں گونج رہی ہے جو آج بھی رہ رہ کر ہمارے دلوں کی طرف لپک رہی ہے مگر ہم نے اپنے دل و دماغ کی کھڑکیاں بند کر لی ہیں۔مولانا کی وہ آواز آتی ہے اور صدائے بازگشت کی طرح پلٹ جاتی ہے۔اس مرد مجاہد کی زندگی میں کسی نے اسے نہ پہچانا تو اب جب کہ تین نسلوں کا فاصلہ درمیان میں حائل ہو کر حجاب بن گیا ہے، اب کون سنے گا۔جب وہ للکار رہا تھا اس وقت کسی نے کان نہ دھرے تو اب کون سنے گا۔یاد کیجیے مولانا کی جامع مسجد کی وہ تاریخی تقریر جس کو سن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے، اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں، اس دردناک تقریر میں انہوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو ایک مرد حق، ہمدم دیرینہ کہہ سکتا تھا۔جس کی صدائے وفا و معقولیت قافلہ قومی نے اجتماعی زندگی کے خطرناک موڑ پر اپنی نافہمی اور ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے نہ سنی اور اپنا نقصان اپنے ہاتھوں کیا۔بڑے درد دل کے ساتھ مولانا نے فرمایا۔درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''تمھیں یاد ہے میں نے تمھیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیے، میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے، میں نے کروٹ لینی چاہی تم نے میری کمر توڑ دی۔۔۔میں نے تمھیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا، بلکہ غفلت وانکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم ہے کہ آج ان ہی خطروں نے تمھیں گھیر لیا ہے، جن کا اندیشہ تمھیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔۔میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی اور میرے دل کو صدمہ ہے سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہونچے اور اب کہاں ٹھہرے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں؟ کیا تمھارے حواس میں اختلال نہیں آ گیا ہے؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ یہ تمھارے اپنے اعمال کے پھل ہیں۔''

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا کی قوم پرستانہ سرگرمیوں کے ابتدائی دور میں کی گئی انقلابی کوششوں کی حمایت سے لے کر آزادی ہند کے اعلان تک یہ دکھائی دیتا ہے کہ مولانا شروع سے آخر تک قوم پرست تھے، جن کا قلب ہندو مسلم جذبہ اخوت سے لبریز تھا اور جو فرقہ وارانہ منافرت نیز آپسی بغض وعناد مٹانے کی ہر ممکن کوشش میں وہ لگے رہے۔ قومی کاموں کے لیے مذہب اور سیاست کو ساتھ لے کر چلنے کی اپنی منفرد خوبیوں کی وجہ سے، ہی انہوں نے عدم تعاون تحریک اور خلافت تحریک کو ایک ساتھ ملانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اپنی غیر جانب داری اور عقلمندی سے انہوں نے ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے خاتمے کو روکا تھا، انہوں نے کانگریس مجلس عاملہ میں اس کی تشکیل کی وقت سے، ہی اپنا مقام بنالیا تھا اور اس کے صدر کی حیثیت سے بھی دو مرتبہ کانگریس کی خدمت کرتے ہوئے کئی اہم مواقع پر ملک وقوم کو نئی جہت عطا کی تھی۔ جنگ آزادی کے دوران تقریباً ساڑھے دس سال کا عرصہ انہوں نے انگریزی حکومت کی جیلوں میں گزارا تھا، مطلب یہ کہ ۱۹۴۲ء تک کی زندگی کے ۵۹ برسوں میں وہ ہر چھ دن میں ایک دن سے کچھ زیادہ جیل میں رہے۔ ۱۹۴۵ء میں جیل سے رہا ہو کر انہوں نے لارڈ ویول کے ساتھ گفتگو میں کانگریس کی نمائندگی کی تھی، لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے مل کر بھی انہوں نے اس بات کی پوری کوشش کی تھی کہ ملک تقسیم نہ ہو مگر افسوس کہ انھیں کامیابی نہ ملی، جس کا انھیں تا عمر افسوس رہا۔

کتابیات:

۱۔ آزادی ہند (انڈیا ونس فریڈم کا اردو ترجمہ) مترجم، ہمایوں کبیر، مکتبہ جمال لاہور، ۲۰۰۳ء
۲۔ خطبات آزاد، ارشد الاسلام، ارشد بک سیلرز، کشمیر، ۱۹۹۹ء
۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندوستانی قومی تحریک، ڈاکٹر جمیل اختر، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۲۰۱۱ء
۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ، مرتبہ، ابوسلمان شاہ جہان پوری، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۶ء
۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد سیرت وشخصیت، علمی اور عملی کارنامے، مرتبہ، ابوسلمان شاہ جہان پوری، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اکیڈمی، کراچی ۱۹۸۶ء
۶۔ ملفوظات آزاد، مرتب محمد اجمل خان، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۶۱ء
۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد (تنقید وتبصرہ کی نگاہ میں) از ابوسعید بزمی، اقبال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۹ء
۸۔ مولانا ابوالکلام آزاد، شخصیت، سیاست، پیغام، رشید الدین خان، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۰۳ء
۹۔ ایوان اردو دہلی کا مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، سلسلہ مطبوعات ۱۹۵، اردو اکادمی، دہلی، ۔۱۵۔۲۰۱۴ء
۱۰۔ خطوط ابوالکلام آزاد، (جلد اول) مرتب مالک رام، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء

محمد شاہد صدیقی (ریسرچ اسکالر) پی ایچ۔ڈی (اردو)
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

عہدِ آصفیہ کا ایک نامور شاعر : ماہر القادری

ماہر القادری 30 جولائی 1906ء کو ضلع بلند شہر، اتر پردیس کے ایک متوسط الحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام منظور حسین ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے ہی مکتب میں ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے والد سے فارسی کی کتابیں بھی پڑھتے رہے۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے ماہرؔ کو اردو، فارسی اور تاریخ میں امتیازی حیثیت حاصل رہی۔ نو دس سال کی عمر میں ہی ماہرؔ کو اخبار و رسائل پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ اس دوران وہ خواجہ حسن نظامی کی سلاست و سادگی اور نیاز فتحپوری کے رومانی اسلوب نگارش سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے 1926ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ماہرؔ نے ملازمت حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے پیر و مرشد مولانا عبدالقدیر بدایونی سے بھی سفارش کی درخواست کی۔

مولانا عبدالقدیر بدایونی کے تعلقات نظام دکن سے بہت خوشگوار تھے۔ حکومت کی طرف سے انہیں وظیفہ بھی ملتا تھا۔ چنانچہ مولانا موصوف کی سفارش سے ماہر القادری کو 1929ء میں حیدرآباد کے محکمۂ ڈاکخانہ میں کلرک کی ملازمت مل گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب مولانا عبدالقدیر بدایونی کی تقرری عدالتِ عالیہ میں بحیثیت مفتی ہوئی تو انہوں نے ماہر القادری کی تقرری عدالت کے صیغۂ انتظامیہ میں کرا دی۔

ماہر القادری کی عملی زندگی کا باقاعدہ آغاز حیدرآباد دکن میں ہوا۔ وہ حیدرآباد میں کم و بیش پندرہ سال تک مقیم رہے اور وہاں کی تمدنی، علمی اور ادبی فضا سے انہوں نے گہرا اثر قبول کیا۔ حیدرآباد دکن میں علم و ادب کے شعبے میں جو بے مثال ترقی ہوئی اس کے نتیجے میں ملک بھر کے اہل کمال وہاں جمع ہو گئے۔ اس ضمن میں ریاست کے وزیر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد کے ہمہ پہلو کمالات اور علمی و شعری ذوق کے ساتھ ساتھ ان کے ذاتی محاسن کا ایک زمانہ معترف ہے۔ عبدالقدیر بدایونی کی وساطت سے ان کا تعارف مہاراجہ کشن پرشاد سے ہوا اور مہاراجہ نے ان کی خصوصی قدر افزائی کرتے ہوئے انہیں اپنے دربار سے وابستہ کر لیا۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ ماہر القادری نے مطالعہ اور محنت و ریاضت کا سلسلہ جاری رکھا۔ حیدرآباد میں آصفیہ لائبریری کے ساتھ ساتھ دار المطالعے بھی تھے اور گشتی کتب خانے بھی۔ ماہرؔ نے ان سب سے علمی استفادہ حاصل کیا۔ جو کتاب مل گئی اسے پڑھ ڈالا۔ ماہر القادری اپنے مطالعے کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> "میرے مطالعہ کا تیسرا دور 1929ء سے شروع ہوتا ہے، جب میں
> حیدرآباد دکن پہنچ چکا تھا۔ وہاں بارہ تیرہ سال کی مدت قیام میں بلا مبالغہ

کتب خانے کھنگال ڈالے۔ حیدر آباد کے دوران قیام میں تفسیر، حدیث،
سیرت، تاریخ، فلسفہ، منطق، افسانہ، شاعری غرضیکہ سب کچھ پڑھ ڈالا۔"

(یادِرفتگاں، ماہر القادری، جلد دوم، ص 402)

اس زمانے میں ماہر القادری کو حیدر آباد میں شعر گوئی اور نثر نگاری کی مشق کے لیے خاطر خواہ فرصت میسر آئی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"طبیعت شعر گوئی اور مضمون نگاری کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہتا۔ آورد اور انقباض کی شاذ و نادر ہی نوبت آئی۔ کسی رسالہ کے ایڈیٹر کا مضمون کے لیے خط آتا، تو میں دوسرے ہی دن کوئی مضمون یا افسانہ لکھ کر بھیج دیتا۔"

(یادِرفتگاں، ماہر القادری، جلد دوم، ص402)

ماہر القادری اپنے وسیع مطالعے، شب و روز کی محنت و ریاضت کی وجہ سے حیدر آباد کے شعر و ادب کے حلقوں میں ترقی اور مقبولیت کی منزلیں طے کرتے رہے اور یہی مقبولیت انہیں نواب بہادر جنگ کے قریب لے آئی۔ ماہر غیر معمولی صلاحیتوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ اس پر مستزاد ان کا شعر پڑھنے کا دل آویز اور مترنم لہجہ تھا کہ بہت جلد وہ حیدر آباد کی شعری محفلوں پر چھا گئے۔ حیدر آباد کے قیام کے دوران ان کی اصلی شہرت شاعری ہی کی بدولت جنوبی ہند میں پھیلی۔

حیدر آباد دکن کے زمانہ قیام میں ماہر القادری کا شمار صف اول کے شعراء میں ہونے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ حیدر آباد کے دینی اور سیاسی حلقوں میں اپنی راسخ العقیدہ اور اسلام پسند شخصیت کی بنا پر بہت مقبول تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دینی اور تبلیغی حلقوں میں تلاوتِ کلام پاک کے بعد ماہر کی نظم مستقل صورت اختیار کر گئی۔ خصوصاً 'مجلس اتحاد المسلمین' کے جلسوں میں نواب بہادر جنگ کی تقریر اور ماہر کی نعت یا ملی نظم لازم و ملزوم بن گئے۔

ماہر القادری کے شعر پڑھنے کے دل آویز خاص انداز کو ان کے ایک دوست محمد عمر مہاجر نے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"جن لوگوں نے ماہر کو مشاعرے میں پڑھتے ہوئے سنا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کا شعر پڑھنے کا انداز کس قدر سحر آفرین اور دل آویز ہے۔ وہ جب اپنے خاص انداز میں شعر پڑھتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا شعر کی روح ان میں سما گئی ہے۔ اور وہ شعر کیا سنا رہے ہیں گویا دل کھول کر سامنے رکھ رہے ہیں۔ ماہر کی شعر خوانی حسن، نغمہ اور شعر کا اجتماع ہے۔"

(ماہنامہ سیارہ، مسعود جاوید، جلد5، ص226)

1933ء میں ماہر القادری حیدر آباد کی ملازمت چھوڑ کر اچانک بجنور چلے گئے۔ وہاں سے مختلف شہروں کی خاک چھاننے کے بعد وہ دوبارہ حیدر آباد دکن آ گئے۔ یہاں ان کی علمی، ادبی و شعری مصروفیات کا سلسلہ

دوبارہ شروع ہوگیا۔ ماہرؔ چونکہ کرشن پرشاد کے دربار سے وابستہ تھے اس لیے اس دربار نے بھی ماہرؔ کے فکروفن کو نکھارنے میں اہم رول ادا کیا۔ ماہر القادری شعر خوانی کے اعتبار سے بہت ہی ممتاز تھے۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حیدرآباد دکن ہی نہیں بلکہ پورے جنوبی ہند میں شاید ہی کوئی ضلع اور شہر ہوگا جہاں کے مشاعروں میں ان کو نہ بلایا جاتا ہو۔ غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں نے ان کو بہت مقبولیت عطا کی۔

ماہر القادری کا نعتیہ کلام عمومی طور پر ادبی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ فصاحت، بلاغت، سلاست، روانی، حقیقت نگاری، تشبیہات واستعارات کی ندرت، زبان کی مٹھاس، لہجے کی شیرینی اور الفاظ کا توازن ان کی نعتوں میں عام ہے۔ اس اعتبار سے ان کے نعتیہ مجموعہ 'ظہورِ قدسی' کا شمار ادب عالیہ میں کیا جاسکتا ہے۔ نعت لکھتے وقت وہ الفاظ کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ نعتیہ اشعار میں یہ احتیاط بہت ضروری ہے۔ موضوع اور فن کی خوبیوں کے اعتبار سے دیکھیں اور کیفیت وکمیت کے اعتبار سے جائزہ لیں تو ماہر القادری کا شمار چند صف اول کے نعت گو شعراء میں کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں کہ انہوں نے نعت کو دعوت وتبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ ان کے نعتیہ کلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

امن ناممکن محمد ﷺ کی غلامی کے بغیر — ان کی رحمت جن کی شفقت اس جہاں میں عام ہے
آپ سے پہلے نہ خوشبو تھی نہ رعنائی تھی — آپ آئے ہیں تو دنیا میں بہار آئی ہے
جانِ حیات ہے تیرے اخلاق کی جھلک — خود زندگی ہے موت کا ساماں ترے بغیر

ماہر القادری کی غزلوں میں تازگی، نغمگی اور رعنائی کا انداز قائم نظر آتا ہے۔ انہوں نے غزل کی کلاسیکی روایت کا خوب احترام کیا ہے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کے نغمے سنائے ہیں اور رمزیت اور اشاریت کے ساتھ ساتھ لطافت و رنگینی کا اسلوب برقرار رکھا ہے۔ زمانے کی بدلتی ہوئی اقدار اور نئے تقاضوں سے بھی وہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اس سے ان کے کلام میں خیال وبیان کی رنگینی و رعنائی اور چاؤ پیدا ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ بقول ڈاکٹر تحسین فراقی۔

> ''ماہرؔ کے بعض اشعار میں ایسی برجستگی اور ایسا بے ساختہ پن ہوتا ہے کہ ان کے ضرب المثل ہو جانے کا قوی امکان ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی شاعر کی اس سے بڑی خوش قسمتی کیا ہوسکتی ہے کہ اس کے شعر زبانوں کی سیادت کریں اور حافظوں پر حکمرانی۔''

(سہ ماہی سیارہ، تحسین فراقی، شمارہ 23، ص97)

ایسے اشعار ان کے پہلے مجموعے سے لے کر آخری زمانے تک کے ذخیرے میں نظر آتے ہیں۔

کسی صورت طبیعت مجھ سے بہلائی نہیں جاتی — ذرا سی آپ سے تکلیف فرمائی نہیں جاتی
فریاد کی فریاد کہانی کی کہانی — وہ بات جو بے تاب نگاہوں نے کہی ہے

اس لیے غم دے کے مجھ کو فرمایا　　　یہ مری آخری عنایت ہے
دل نے آغاز محبت میں دعا مانگی تھی　　　جیت ہی جیت رہے، ہار نہ ہونے پائے

ماہر القادری کے شعری مجموعوں میں ظہورِ قدسی (نعتیہ مجموعہ)، طلسم حیات، محسوسات ماہر، نغمات ماہر، جذبات ماہر اور نقش توحید شامل ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے بہت سے اشعار عوام میں بے حد مقبول ہوئے۔ ایسے ہی دو اشعار پر میں اس مقالے کا اختتام کر رہا ہوں۔

چشم نم پر مسکرا کر چل دیے　　　آگ پانی میں لگا کر چل دیے
ساری محفل لڑکھڑاتی رہ گئی　　　مست آنکھوں سے پلا کر چل دیے

قاری نصیر الدین منشاوی اور مولانا حمران احمد معروفی کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدر آباد نے ان دونوں کی تکمیل پی ایچ ڈی پر کی گل پوشی

حیدر آباد: قاری نصر الدین منشاوی خطیب جامع مسجد عالیہ گن فاؤنڈری کو ان کے پیش کردہ مقالہ ''مولانا شبلی نعمانی کی سوانح نگاری میں ادبی وتاریخی بصیرت'' پر اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔ ان کے تحقیقی مقالے کو ممتحن حضرات نے سراہا اور مبارکباد دی۔ اس مقالے کو انہوں نے پروفیسر فاطمہ بیگم سابق وائس پرنسپل آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی کی زیرنگرانی مکمل کیا ہے۔ واضح رہے کہ حافظ وقاری محمد نصیر الدین منشاوی کی چار کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ اس موقع پر شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ نے ان کی گل پوشی کی اور جملہ ٹرسٹیوں نے ان کو مبارکباد پیش کی۔

مولانا حمران احمد معروفی ولد عبد الغفار پردھان مرحوم کے پی ایچ ڈی کا زبانی امتحان ا ہوا، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد نے ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری کا مستحق قرار دے دیا ہے، اس تقریب میں پروفیسر صاحب علی صاحب صدر شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی نے بطور ممتحن شرکت کیا اور ان کے مقالے سماعت کرنے کے بعد اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ مقالے کا عنوان انتہائی جامع ومانع ہے، مولانا حمران احمد معروفی نے ''اردو ناولوں میں جدوجہد آزادی کی عکاسی کا تنقیدی تجزیہ'' کے عنوان سے بڑی محنت سے مقالہ لکھا ہے، جو قابلِ ستائش ہے، ان کو ایک بہترین عنوان پر پی ایچ ڈی کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ نگراں پروفیسر ابوالکلام نے بھی ان کی کوششوں کو سراہا اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

اس سے پہلے انھوں نے اسی شعبہ سے شمس الرحمٰن کے ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' پر ایم۔فل مکمل کیا ہے۔ مولانا اس وقت ایم۔ایس کریٹیو اسکول حیدر آباد آباد میں اردو کی خدمت انجام دینے کے ساتھ ساتھ مسجد منیزہ ،نبیل کالونی ،حیدر آباد میں خطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اس پروگرام میں بطور خاص پروفیسر نسیم الدین فریس صاحب صدر شعبہ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد، ڈاکٹر شمس الھدی، ڈاکٹر مسرت جہاں، ڈاکٹر وسیم بیگم، ڈاکٹر فاروق، ڈاکٹر شاہد نوخیز، ڈاکٹر محامد ہلال، ڈاکٹر رفیق، ابو ہریرہ یوسفی شریک رہے اور سبھی نے مبارکباد پیش کی۔

حضرت رحمن جامی

نعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم

محبت ہی محبت ہیں محمد مصطفیٰؐ میرے
زمانے بھر میں رحمت ہیں محمد مصطفیٰ میرے

ابھی وا ہے درِ توبہ گنہگارو نہ گھبراؤ
شفاعت ہی شفاعت ہیں محمد مصطفیٰ میرے

اجالے میں بدلنے کے لئے دنیا کی تاریکی
چلو شمعِ ہدایت ہیں محمد مصطفیٰ میرے

شبِ معراج میں کی ہے امامت سارے نبیوں کی
کہ سردارِ رسالت ہیں محمد مصطفیٰ میرے

مَیں ہوں کمزور اور مظلوم میرا آسرا یہ ہیں
میرے ایماں کی طاقت ہیں محمد مصطفیٰ میرے

زمین وآسماں جن کے اجالے سے منور ہیں
وہ نورِ علم وحکمت ہیں محمد مصطفیٰ میرے

جو تھامے دامنِ احمد وہی منزل رسیدہ ہے
شریعت ہیں طریقت ہیں محمد مصطفیٰ میرے

شریعت ہیں طریقت ہیں حقیقت ہیں رسالت ہیں
بصارت ہیں بصیرت ہیں محمد مصطفیٰ میرے

سنو! اے مفلسو آؤ محمد کی طرف آؤ
زمانے بھر کی دولت ہیں محمد مصطفیٰ میرے

مجھے رحمٰن جامیؔ فخر ہے امت میں ہوں ان کی
جہاں میں میری عظمت ہیں محمد مصطفیٰ میرے

غزل

پھول پھینکے کہ مری راہ میں پتھر پھینکے
جس کو جو پھینکنا ہے سوچ سمجھ کر پھینکے

لہر اٹھے گی تو یہ عکس بھی چھن جائے گا
پرسکوں جھیل میں اب کوئی نہ کنکر پھینکے

لفظ ہیں پھول بھی اور لفظ ہیں پتھر بھی مگر
لفظ کچھ اور ہی تھے اس نے جو مجھ پر پھینکے

میں گنہگار سہی مجھ پہ بقولِ عیسیٰ
جو گنہگار نہیں ہے وہی پتھر پھینکے

ہائے لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہے نشہ یہ بھی
توبہ کرنے کے لیے میں نے جو ساغر پھینکے

میں نے بچ بچ کے دکھایا ہے ہر اک بار اسے
جال دنیا نے تو ہر بار برابر پھینکے

حال اپنا جو چھپانا ہی کسی کو ہے تو وہ
گھر کا کوڑا بھی نہ دروازے کے باہر پھینکے

اس کو یہ بات ذرا یاد دلادو جامیؔ
جس کا شیشے کا مکاں ہے وہ نہ پتھر پھینکے

عثمان ساحرؔ مبارک پوری

نعت رسولؐ

صبا بتادے مجھے راستہ مدینے کا
وہیں پہ لطف ہے مرنے کا اور جینے کا

میں جان دیدوں پہونچ کر درِ حضور کے پاس
ہے صرف اتنا ہی ارمان مرے سینے کا

نسیم مشک فشاں ہے فضا معطر ہے
چلا ہے طیبہ سے جھونکا کوئی پسینے کا

محمدِ عربی ناخدا ہیں جب ہمدم
ہر ایک موج ہے ساحل مرے سفینے کا

ہے نقش و عکسِ سراپا جمالِ احمد کا
نہ پوچھ حال مرے دل کے آبگینے کا

زہے نصیب تصور میں ان کا کوچہ ہے
سراغ مل گیا فردوس جاں کے زینے کا

فقط نگاہ کرم کا بھروسا ہے ساحرؔ
نہ پاس نیکی نہ کچھ ہے عمل قرینے کا

غزل

نہ دل ہے اور نہ دل کی ترجمانی
کہانی ہے کہ ایام جوانی

گھٹا ہے اور شراب ارغوانی
ترے بن سانپ ہے یہ رُت سہانی

چرا لائی خرام ناز تیرا
سبک شفاف موجوں کی روانی

تکلّف بر طرف تشریف لائیں
یہ دل ہے آپ ہی کی راجدھانی

نگاہوں سے چھپا کے دل میں رکھنا
یہ کہدیتی ہیں اسرار نہانی

جانے کیسا رشتہ ہے رہگزر سے قدموں کا
تھک کے بیٹھ جاؤں تو راستہ بلاتا ہے
شکیل اعظمی

نذرِ عقیدت آستانِ شبلی

☆یحییٰ اعظمی

خوشاوقتے کہ یوسف زینتِ آغوش کنعان تھا — وطن کا گوشہ گوشہ معدنِ لعلِ بدخشاں تھا
تمہیں بھی یادہ ہے اے آسمانِ علم کے تارو — کبھی تم میں ضیا افروز اک ماہِ درخشاں تھا
وہ ماہِ جلوہ آرا جس کی نورانی شعاعوں سے — وطن کا ذرہ ذرہ آفتابِ علم وعرفاں تھا
عزیز مصرِ فن جس کے فیوضِ حسنِ معنی سے — یہ شہرستانِ دانش مدتوں تک یوسفتاں تھا
وہ رمزہ آگاہ جس کا سینہ حکمت کا خزینہ تھا — وہ بینا جس میں عمانِ معانی محوِ طوفاں تھا
نوائے راز پر جس کے سروشِ آسمان صدقے — صریرِ کلک پر جس کے دبیر چرخ رقصاں تھا
غزالی اور رازی محرم اسرار تھے جس کے — ظہیر فاریابی جس کا اک طفلِ دبستاں تھا
وہ جس کی ہر نظر سرمستِ جامِ ہوش وآگاہی — وہ جس کا ہر نفس رمز آشنائے علم وعرفاں تھا
وہ دورِ بادۂ حکمت تھا اس کے فیض سے جاری — کہ جس کا جرعہ کش دشتِ عرب سے تا بہ ایراں تھا
وہ جوش اٹھا تھا موج بادۂ رنگین مشرق سے — کہ جس کے شور سے خمخانۂ مغرب میں طوفاں تھا
منور ہوگئی تھی بزمِ ملت کثرتِ ضو سے — کچھ ایسا ہر طرف فیضِ فروغِ شمعِ عرفاں تھا
کبھی تھا آستانِ پاکِ سرور پر سر افگندہ — کبھی خود جستجو سے راز میں سر درِ گریباں تھا
کبھی گلدستہ بندِ سیرتِ پیغمبر عالم — کبھی حکمت طراز نکتہ ہائے علم وعرفاں تھا
صحیفہ لے کے حاضر تھا کبھی عشق وعقیدت کا — مگر یہ ارمغان اس درگہِ عالی کے شایاں تھا
رہا کرتے تھے ہردم جس پہ قدسی ناصیہ فرسا — گدائے بینوا اس آستاں پر گوہر افشاں تھا
ملک جس کی نگارش کا ثنی لیتے جاتے تھے — فلک معمور تھا جس کی نوا سے یہ وہ انساں تھا
نگارستان چین صدقے تھا جس کے حرفِ رنگین پر — تصدق جس کے نقشِ کلک پر نقش سلیماں تھا
وہ فخرِ حافظ وخسرو وہ نازِ سعدی وسلمان — کہ ہند اس کی بدولت رشکِ شیراز وصفاہاں تھا
وہ نقاد ومعانی صاحبِ شعرالعجم یعنی — عرب سے تا عجم جس کی نواسنجی پہ رقصاں تھا
شرف اس کا مسلم تھا جہاں علم ودانش میں — تفوق اس کا دنیائے معارف میں نمایاں تھا
خطابت میں ادب میں نقد فن میں نکتہ سنجی تھا — وحید عصر وفخر روزگار ونازِ دوارں تھا

کہیں صدیوں میں ہوتا ہے یہ فیضِ خاص ربانی
نہیں اٹھتے ہمیشہ دہر میں شبلیِ نعمانی

ونڈے کرکٹ کا وراٹ

☆ابو ہریرہ ای ٹی وی

کہتے ہیں کہ ہر کسی کا ایک دور ہوتا ہے۔اور آج کی کرکٹ کا دور ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے کپتان وراٹ کوہلی کا ہے۔کوہلی اس وقت ونڈے کرکٹ کے افق پر پورے آب وتاب سے جگمگا رہے ہیں۔جنوبی افریقہ میں ان کا شاندار مظاہرہ اس کی تازہ مثال ہے۔جہاں وراٹ نے افریقہ کے تیز گیند بازوں کی دھجیاں اڑا دیں۔یہی نہیں وراٹ نے کپتانی کا حق ادا کرتے ہوئےجہاں سیریز میں سب سے زیادہ رن بنائے تو وہیں کئی ریکارڈ اپنے نام بھی کئے۔یعنی کوہلی نے جنوبی افریقہ میں ون ڈے سیریز جیتنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔چھ میچز کی سیریز میں ان کے اعداد وشمار اس کے شاہد ہیں۔انھوں چھ میچز میں 186 کی اوسط سے 558 رن بنائے،اُن میں تین سنچریاں بھی شامل ہیں۔بلے بازی میں کوہلی کا غلبہ اتنا تھا کہ ان میں اور دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ رنز بنانے والے شیکھر دھون میں 235 رنکا بڑا فرق ہے۔یہاں یہ بالکل عیاں ہے کہ وراٹ کوہلی نے جو کارکردگی افریقہ میں ونڈے سیریز میں پیش کی ہے۔اس نے کوہلی کے ناقدین کے منہ بند کردیئے ہیں۔یا یوں کہا جائے کہ کوہلی کے ناقد بھی اب کوہلی کی تعریف کرتے نہیں تھک رہے ہیں۔دراصل جو کارنامہ کوہلی نے افریقہ کی سرزمین پر انجام دیا ہے۔وہ اپنے آپ میں تاریخی ہے۔کیوں کہ اس سے قبل کبھی بھی ٹیم انڈیا،جنوبی افریقہ میں ونڈے سیریز نہیں جیت پائی تھی۔یعنی ٹسٹ سیریز میں شکست کے بعد ونڈے میں ٹیم انڈیا پر خطرہ منڈلا رہا تھا۔لیکن ونڈے سیریز میں کوہلی کی کارکردگی دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ کوہلی نے پوری سیریز کا ذمہ اپنے سر لے لیا تھا۔اورانھوں نے گویا تاریخ کے رخ کو موڑنے کا عزم کررکھا تھا۔خیر۔اس شاندار کارکردگی اور تاریخی جیت کے بعد جہاں ٹیم انڈیا میں کوہلی کے قد میں مزید اضافہ ہوا ہے۔تو وہیں اب ٹیم انڈیا عالمی کپ کی سب سے بڑی دعویدار بن کر ابھری ہے۔۔وراٹ کوہلی کی اس لاجواب کارکردگی کے بعد کرکٹ جانکار یہ بھی کہنے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ ماسٹر بلاسٹر سچن تینڈولکر کا سنچریوں کا ریکارڈ بھی اب محفوظ نہیں لگتا۔۔ویسے دو الگ ادوار میں دو الگ الگ کھلاڑیوں کا موازانہ معقول نہیں معلوم ہوتا لیکن شائقین و ناقدین دونوں جانے اور انجانے میں اس کے مرتکب ہو ہی جاتے ہیں۔ویسے سچن اور وراٹ میں ایک بات جو مشترک ہے وہ یہ دونوں اپنے اپنے دور کے مایہ ناز بلے باز ہیں۔یہاں اگر میچوں کے حساب سے سچن اور کوہلی کا موازنہ کیا جائے تو بھی کوہلی،سچن سے وراٹ نظر آتے ہیں۔۔

وراٹ کوہلی۔۔208 میچ۔۔35 سنچری۔۔۔رن۔9588۔۔۔اوسط۔۔58.10

سچن تینڈولکر۔۔463 میچ۔۔49 سنچری۔۔۔رن۔18426۔۔۔اوسط۔۔44.83

اس ٹیبل پر نظر دوڑائیں تو دونوں بلے بازوں میں فرق صاف نظر آرہا ہے۔وراٹ کوہلی کا اوسط،سچن سے کہیں بہتر ہے۔اگر کوہلی،سچن کے جتنے ونڈے میچز کھیلتے ہیں اور اسی کنسسٹنسی سے بلے بازی کرتے رہے،تو بعید نہیں وہ سچن تنڈولکر کی سنچریوں کی چوٹی کو عبور کرلیں۔سچن کے مجموعی اٹھارہ ہزار رنوں کے پہاڑ کو سرکرنا وقت طلب ضرور ہے لیکن ناقابل تسخیر نہیں۔۔۔ٹیم انڈیا کی خوش نصیبی ہے کہ اسے اعلی کرکٹروں کی خدمات حاصل ہو رہی ہیں۔ایسے کرکٹر جو اپنے کارناموں سے نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کرتے ہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی اُن کو احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔وراٹ آج اسی مقام پر ہیں۔

تبصرۂ کتب

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا،اس لئے مصنفین ،مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دو عدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔(ادارہ)

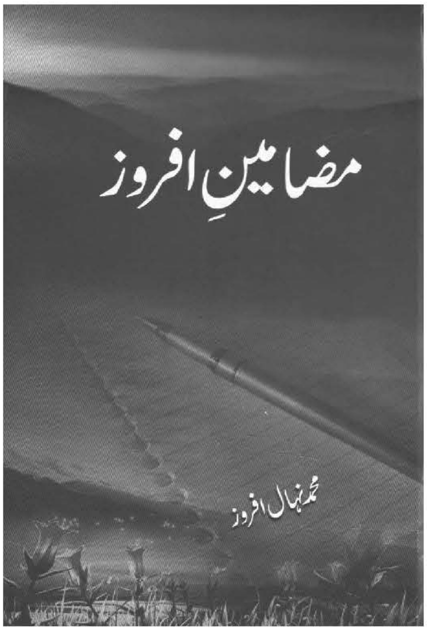

تبصرہ نگار:**ابو ہریرہ یوسفی**

مضامینِ افروز

مصنف:محمد نہال افروز

صفحات:168

قیمت:200

سنہ اشاعت:2017ء

ناشر:روشان پرنٹرس، دہلی۔٦

زیر نظر کتاب محمد نہال افروز کا گلدستۂ مضامین ہے،مصنف ابھی طالب علمی کے دور سے گزر رہے ہیں،مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے ریسرچ اسکالر ہیں۔کتاب کے جملہ مضامین رسائل وجرائد میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔اس سے پہلے موصوف کی مزید تین کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔اس کتاب میں چودہ مضامین شامل ہیں،جو تحقیق،تنقید اور معلومات پر مشتمل ہیں۔اردو کے ساتھ ہندی فکشن، ہندی کہانیوں اور ہندی ادیبوں کے تعلق سے معلومات افزا مضامین ہیں۔بطورِ خاص ’’ہندی کہانیوں کے ابتدائی نقوش، ہندی فکشن میں مسلم تخلیق کاروں کا حصہ، ہندی کہانیوں میں خواتین کا حصہ، جیسے مضامین کا مطالعہ کرنے سے اردو پڑھنے والوں کو ہندی ادب کے سلسلے میں نئی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔اس کے علاوہ ہندی کے ان دس ادیبوں کی فکشن نگاری اور ان کی کہانیوں اور ناولوں کی کتابوں پر مختصر ہی سہی مگر معیاری تحریر ہے۔علاوہ ازیں ایک مضمون میں ہندی کہانی کاروں میں خواتین کا حصہ دکھایا گیا ہے،تقریباً پندرہ خواتین کا تذکرہ کیا گیا ہے،غالباً اس طرح کے مضامین بہت کم ملتے ہیں۔دیگر مضامین بھی خوب سے خوب تر ہیں۔بہرکیف نہال افروز کی یہ کتاب قابل مطالعہ ہے،ان کی یہ کاوش قابل ستائش ہے۔